رختِ سفر

(شاعرِ مشرق کا غیر مُدوّن کلام)

مُرتّبہ

محمّد انور حارث بی۔اے

نقشِ اوّل ———————— جنوری ۱۹۵۲ء

جملہ حقوق محفوظ

قیمت فی جلد ۸ روپے

انتساب

ہز ایکسیلینسی ڈاکٹر شیخ دین محمدؐ

(ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی)

گورنر صوبہ سندھ

کے نام

جن کی رائے روشن سے مؤلّف بدرجہ اتم

مستفیض ہوا

پیغام

از عزّت مآب ڈاکٹر محمود حسین

وزیر امور کشمیر

حکومتِ پاکستان

محمدؐ انور حارث پاکستان کے نوجوان ادیبوں میں سے ہیں۔ انھوں نے شاعرِ مشرق علّامہ اقبال کا ایسا کلام مُدوِن کیا ہے۔ جو اُن کے کلام کے مشہور مجموعوں میں نہیں پایا جاتا۔ گو یہ اشعار وہ ہیں جو علّامہ اقبال نے خود حذف کر دیئے تھے مگر اُن کی ایک تاریخی اہمیت ہے۔ اور اقبال کی شاعری کے ارتقا کو سمجھنے کے لئے ان کا جاننا ضروری ہے۔

حارث صاحب قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے کافی محنت و کاوش سے ایسے اشعار کو یک جا کر کے عوام کو اُن سے روشناس کر دیا۔

محمود حسن

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تقریظ

از محمد اسحاق صاحب امرتسری

سابق مدیر ماہنامہ "ماہِ تمام" و روزنامہ "مسلم گزٹ"
"ہند جدید" وغیرہ وغیرہ

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود ؛ گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

حضرت اقبال فرماتے ہیں کہ :-

اگر امروز تو تصویر دوش است ؛ بخاک تو شرار زندگی نیست

اگر تیرا آج کا دن گذشتہ رات کی تصویر ہے اور عملاً و معناً ایسا ہی ہے جیسی کہ کل کی رات تھی تو تیری خاک میں زندگی کے شعلے نہیں ہیں۔ تو زندہ نہیں ہے۔ اور یقیناً اقبال کی زندگی کا ہرامروز اُن کے ہر دیروز سے بہتر اور خوش تر تھا۔ اور یقیناً ان کی زندگی کے تدریجی ارتقا و نشو نما کے مراحل اب بھی ارباب نظر کے لئے مشعل راہ ہیں۔ وہ لوگ جو اقبال کی شاعری کو روزِ اول ہی سے کامل اور اکمل صورت میں پیش کرنے کے خواہشمند ہیں وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ کسی انسان کی تخیل اور اندازِ نگارش رطب و یابس اور بلندی و پستی سے معرا نہیں ہوتا۔ اقبال خود اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ

می شود پردۂ چشم پر کاہے گاہے ؛ دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے

اور سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ :-

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم ؛ گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

اقبال کے پہلے دور کا وہ کلام جو ماہنامہ "مخزن" اور اُس دور کے رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوا تھا اور ان کی وہ غزلیں اور نظمیں جو اُس زمانہ کے متعدد مشاعروں اور جلسوں میں پڑھی گئی تھیں، وہ اُن کے زمانۂ حیات میں کسی مرتب و مدون صورت میں شائع نہ ہو سکیں۔ ممکن ہے کہ انھیں دیگر اہم تصنیفات کی ترتیب و تدوین کی مشغولیت کے باعث اتنا وقت نہ ملا ہو کہ ان پر نظرِ ثانی کر کے انھیں اپنی نگرانی میں شائع کرا دیں اور ہو سکتا ہے کہ یہ کلام ان کی باریک بیں نگاہ سے گر گیا ہو اور دوبارہ اشاعت کے قابل نہ سمجھا گیا ہو، مگر اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ ان کا یہ کلام بھی ہنوز اکثر اصحاب علم کے کتب خانوں میں موجود ہے۔ اور جس کسی کے پاس موجود ہے وہ اسے تبرک نایاب سمجھ کر اپنی تحویل میں محفوظ رکھتا ہے اور اپنے دوستوں کی محفلوں میں فخریہ پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اقبال کی یہ نظم فلاں جلسہ میں پڑھی گئی تھی اور یہ غزل فلاں اور فلاں پرچے میں چھپ چکی ہے اور وہ پرچے میرے پاس محفوظ ہیں۔

خرم آں کس کہ دریں گرد سوارے بیند جوہر نغمہ ز لرزیدن تارے بیند

اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اقبال کے بعض اداشناس جب اپنی تصنیفات میں ان کے کلام کے نمونے پیش کرتے ہیں تو دو چار غیر مرتب یا غیر مطبوعہ غزلیں بھی شائع کر دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان غزلوں کی خوبیوں اور بلاغتوں کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ "ہر چہ از یار می رسد نیکو است"۔ ظاہر ہے جب اقبال کی زندگی کے سب چھوٹے بڑے واقعات حتیٰ کہ ان کے ملازم علی بخش کے اطوار و عادات بھی شیدایانِ اقبال کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ان کا ازیلہ

رفتہ کلام بھی جس کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف ان کی اس دور کی زندگی کے جذبات و تصورات سے وابستہ ہے وہ لوگوں کی دلچسپی کا موجب نہ ہوسکے اور اسے طاقِ نسیاں پر رکھ دیا جائے اقبال کہتے ہیں کہ:۔

بہ کسے عیاں نہ کردم زکسے نہاں نہ کردم ؛؛ غزل آنچناں سرودم کہ بروں فتاد رازم

اردو علم و ادب کے شائقین کو یہ دیکھکر خوشی ہوگی کہ جناب محمد انور حارث صاحب بی۔ اے نے اقبال کے اس غیر مدون کلام کو مدون و مرتب کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ حارث صاحب پاکستان کے نوجوان مشاق انشاپرداز ہیں اور انگریزی اور اُردو ادب سے یکساں دلچسپی رکھتے ہیں۔ قائدِ اعظم کی صحیح تاریخ ولادت کے بارے میں آپ کی دریافت جو ایک کتابچہ کی شکل میں پچھلے دنوں شائع ہوچکی ہے۔ آپ کے تحقیقی ذوق کی آئینہ دار ہے۔ ان کے اس مدون مجموعہ کے بہت سے ابتدائی اجزا میرے پیشِ نظر ہیں اور اُن کی یہ خواہش ہے کہ اقبال کے اس مجموعۂ کلام کے متعلق میں اپنا تبصرہ بھی پیش کردوں، مگر اس فہمائش کی کماحقہٗ تکمیل حالات حاضرہ میں میرے لئے مشکل ہے کہ میں اِن دنوں اقبال کی تصنیف رموزِ بیخودی کے نکات پر غور کر رہا ہوں:۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی ؛؛ اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہوتے

البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس مجموعہ کے سرسری مطالعہ سے اقبال کے تخیل کے چند ایسے پہلو بھی نمایاں ہو جاتے ہیں جو مشرقی سیاست اور تمدن کے امور میں سنگِ میل کی اہمیت رکھتے ہیں اور ان پر غور و فکر کا زمانہ بڑی تیزی سے قریب آرہا ہے۔ ثانیاً اس مجموعہ میں ایسے زاویہ ہائے فکر بھی موجود ہیں جنھیں بعد کے ادوار میں اقبال نے ناقص سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ اس طرح

کا تضاد فکر ان کی شخصیت کی عظمت پر اثر انداز نہیں ہوتا کہ خطا و نسیان ہر انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ اقبالؔ خود کہتے ہیں مردِ حق پرست کی زندگی کا سفر خواہ وہ کیسے ہی ناقص راستوں سے کیوں نہ دوچار ہو بالآخر راہِ راست پر ضرور آجاتا ہے۔ اور منزلِ مقصود کو پا لیتا ہے۔ ؎

عشق شور انگیز را ہر جادہ در کوئے تو برد
بر تلاشِ خود چہ می نازد کہ رہ سوئے تو برد

بہر نوع یہ مجموعہ حضرت اقبالؔ مرحوم کے ایک سچے قدرشناس کی شبانہ روز محنت اور جدّوجہد کا مرقع ہے، جو ملک کے اہلِ علم اور اہلِ نظر کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اُمید ہے کہ لوگ اسے اسی خلوص کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ جس خلوص و محبّت سے یہ مرتب کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ کا مطالعہ کرتے ہوئے قارئین اس شعر کو بھی نگاہ میں رکھیں کہ اقبالؔ کہتے ہیں کہ:۔

از روزگارِ خویش نہ دانم جز ایں قدر
خوابے زیاد رفتہ و تعبیرم آرزوست

پیش کش

"مجموعے کی اشاعت کے سلسلے میں مجھے جس دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس کا تعلق نظموں کے انتخاب سے ہے۔"

یہ سطور اس اہم مراسلہ کا جزو ہیں جو حکیم امت علامہ اقبالؒ نے لاہور سے ۷/ جولائی ۱۹۱۱ء کو محترمہ عطیہ بیگم فیضی صاحبہ کے نام لکھا تھا۔ اُس وقت "بانگ درا" اقبال کے کارگہِ فکر میں زیر تشکیل تھی۔ مگر انتخاب کلام، ترتیب اشعار اور جدت عنوانات کا مسئلہ ابھی حل نہ ہوا تھا۔ بارے ایک عرصے کے بعد شاعرِ مشرق کے شہرۂ آفاق اردو کلام کا اولین مجموعہ پہلی بار ستمبر ۱۹۲۴ء میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ اس دیوان کو اقبال نے بذاتِ خود ترتیب دیا تھا۔ لہٰذا اس میں حسن انتخاب، آپ اپنا جواب تھا۔ تاہم اپنے کلام کا ایک معتدبہ حصہ جو رسالوں اور گلدستوں کی زینت بنا ہوا تھا۔ علامہ مرحوم نے اس مجموعے میں شامل نہیں فرمایا۔ میں نے انھیں جواہر پاروں کو "مخزن" "ادیب" اور "معارف" کے قدیم ترین شماروں اور دورِ حاضر کے اوّلین اخبارات و کتابچوں سے اخذ کر کے شیدائیانِ اقبال اور دیدہ وران علم و ادب کی ضیافتِ ذوق کے لئے ان صفحات پر منتقل کر دیا ہے۔ علاوہ ان نوادرات کے اس کتاب میں علامہ اقبال کے اس فارسی کلام کو بھی جگہ دی گئی ہے جو مثنوی "اسرارِ خودی" و "رموزِ بیخودی" کے صرف پہلے اڈیشنوں میں شائع ہوا تھا۔ نیز علامہ کی ایک تحریر کو بھی جو ایک نظم کی تمہید تھی اس مجموعہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا سطور سے قارئین کو اندازہ ہوا ہوگا کہ "رختِ سفر" کی صورت میں علامہ کا جو کچھ اُردو فارسی کلام جمع ہوا ہے اس کا ۱۹۱۱ء اور سالہائے ماسبق کی ان نظموں سے کچھ علاقہ نہیں جن پر اکثر و بیشتر بجی رنگ غالب ہے اور جن کا ذکر اقبال نے اپنے منقولہ بالا مکتوب گرامی میں کسی اور مقام پر فرمایا ہے۔ اسی بنا پر میں یہ کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ جس کلام سے یہ اوراق مزین ہیں وہ اقبال کا غیر مطبوعہ کلام نہیں ہے بلکہ کسی نہ کسی صورت میں اور کبھی نہ کسی وقت منظرِ عام پر آچکا ہے۔۔ رہا یہ سوال کہ جس کلام کو علامہ نے خود حذف کر دیا تھا۔ اسے دوبارہ شائع کرنے کی کیا ضرورت ؟

اس سوال کا جواب اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ یہ سمجھنا کہ اقبال نے کس خیال کے ماتحت ایسے بلند پایہ اور روح پرور کلام کو "بانگ درا" میں شامل کرنے سے گریز فرمایا۔ یوں تو بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ اسکی ایک وجہ علامہ کی نظرثانی اور حسنِ تنقید و انتخاب ہے۔ لیکن اس جواب سے محققین کی تشفی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ ان محذوفات میں ایک کثیر تعداد ایسے اشعار کی بھی پائی جاتی ہے جو "بانگ درا" کے اشعار کے مقابلہ میں پست اور فروتر نہیں ہیں۔ پھر کس بنا پر ایسے معیاری کلام کو "بانگ درا" میں درخورِ اشاعت نہیں سمجھا گیا۔ اس امر کی تحقیق کے لئے ہمیں اس دور کے ثقافتی ماحول اور سیاسی پس منظر پر نگاہ ڈالنی چاہیے جس سے متاثر ہونا اقبال جیسے فلسفی شاعر کے لئے ناگزیر تھا۔ یہ دور مسلمانانِ ہند کے لئے سخت ابتلا و آزمائش کا دور تھا جس کا سلسلہ بیسویں صدی کے آغاز سے لیکر ۱۹۱۴ء کے آخر تک رہا۔ اسی زمانے میں ہمعصر مخالف قوتیں حکومت انگلسیہ کا سہارا لے کر مسلمانوں کے جداگانہ وجود کو ختم کرانا چاہتی تھیں۔ اسی عہد میں اسلامیان ہند کو "خودی" کا بھولا ہوا سبق سکھانے کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ کی نیو پڑی تھی۔ گرد و پیش کے ان حالات کا اثر اقبال کے کلام پر پڑا۔ چنانچہ "صدائے درد" "ایک آرزو" "فریادِ امت" "تصویرِ درد" "نہا شوالہ" "پیامِ عمل" "نالۂ یتیم" "شکوہ و جوابِ شکوہ" "قطعہ" وغیرہ وغیرہ اسی دور کی یادگاریں ہیں۔ اقبال کی یہ نظمیں اور اس عہد کی متعدد غزلیں وقتاً فوقتاً ملک کے موقر جرائد اور مستند رسائل اور گلدستوں

میں زیب قرطاس ہوتی رہیں۔

۱۹۲۴ء میں جب "بانگِ درا" کی تدوین کا کام شروع ہوا حالات بدل چکے تھے اور جمود و تعطل کی جگہ کاروانِ ملت میں جوشِ عمل اور حصولِ مقصد کے لئے مجنونانہ بیخودی و سرمستی پیدا ہو چکی تھی۔ گو بظاہر تحریک خلافت کی ناکامی نے دلوں کو افسردہ اور حوصلوں کو پست کر دیا تھا۔ تاہم مایوسی تھی کہ پاس نہ پھٹکتی تھی اور امید تھی کہ جس کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹتا تھا۔ اقبال نے اس اندازِ فکر کی ترجمانی یوں فرمائی ؎

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند ۔۔۔ می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

اور انہی حقائق کے پس منظر میں جب ترجمانِ حقیقت نے اپنے گذشتہ اردو کلام پر نظر ڈالی تو اس میں بہت سی ایسی باتیں نظر آئیں جنھیں "بانگِ درا" میں شائع کرنا اگر غیر مناسب نہیں تو عین مصلحت بھی نہیں تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے اپنے نظریہ قومیت و وطنیت، سیاسی اغراض و مقاصد اور زاویہ ہائے فکر و نگاہ میں تجربات کی کشمکش اور حوادث کی آمیزش سے کچھ ایسا تغیر واقع ہوا تھا کہ جس کے پیشِ نظر سابقہ خیالات و احساسات کو تمام و کمال منظرِ عام پر لانا اقتضائے خلوص و نیک نیتی کے منافی تھا۔ بقولِ صاحب "موجِ کوثر"۔۔۔۔ "اس کی نیچرل اور قومی نظمیں ساری قوموں میں مقبول تھیں اور خیال کیا جا رہا تھا کہ وہ ہندوستان کے بیدار شدہ سیاسی احساسات کا مظہر ہوگا لیکن اقبال نے خود اس قبولیت عامہ کو ٹھکرا کر اپنی شاعری کیلئے ایک علیحدہ راستہ اختیار کیا جس میں دقتیں اور مخالفتیں تھیں لیکن جس کی ضرورت وہ خود سمجھتا تھا۔"

اس احساس کے پیدا ہوتے ہی اقبال نے "بانگِ درا" کے صفحات میں شدومد سے کتر بیونت کی اور اس دوران میں بہت سے ایسے اشعار کا بھی قلع قمع کر دیا جنھیں مندرجہ بالا ذہنی افتاد سے کچھ سروکار نہیں تھا۔ اس مد کے اشعار میں وہ غزلیں بھی شامل ہیں جنھیں زیر نظر مجموعے میں جگہ دی گئی ہے۔ لیکن جیسا کہ اقبال نے خود فرمایا ہے۔

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود ۔۔۔ کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

امتدادِ زمانہ اس نوع کے کلام اور اس کے اقدار کو گھن نہیں لگا سکا۔ ۱۹۴۷ء کے لاثانی انقلاب نے جہاں تاریخ کے ایک اہم باب کا خاتمہ کر دیا، وہاں اس شدید ضرورت کا بھی احساس دلایا کہ نقوشِ ماضی کا آئینۂ حال میں مطالعہ کیا جائے اور جس ماضی کا تعلق "اقبالیات" سے ہو اس کو نظر انداز کرنا تاریخ کے ایک عظیم الشان پہلو سے پہلو تہی کرنا ہے۔ اسی حقیقت کو جناب محمد اسحاق امرتسری صاحب نے اپنی جامع تقریظ میں اجاگر فرمایا ہے اور میں اسحاق صاحب کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے کمال مہربانی اور شفقت سے ایک قلیل عرصہ میں یہ کام سرانجام دیا۔

یہاں اس امر کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ مجموعے کی تدوین کا سلسلہ ایک مدت سے جاری تھا۔ اور اس ضمن میں اکثر مقامات پر سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر ہز اکسی لینسی شیخ دین محمد صاحب بالقابہ کی عنایات و مراحم نے ہر مشکل کو آسان کر دیا۔ صاحب موصوف نے اپنی اشد مصروفیتوں کے باوجود بارہا راقم الحروف کو شرفِ ملاقات بخشا اور اپنے گرانبہا اور مفید مشوروں سے مجموعے کو کامیاب بنانے میں اعانت بہم فرمائی۔ میں ہز اکسلینسی کا تہِ دل سے مشکور ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ آپ کی یہ علم دوستی اور ادب نوازی تا حیات قائم رہے۔ آمین۔

عزت مآب ڈاکٹر محمود حسین صاحب کے شکریہ کیلئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ آپ نے کثرتِ مشاغل اور عدیم الفرصتی کے باوصف مجموعے کی اہمیت کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے ایک نہایت ہی حوصلہ افزا پیام مرحمت فرمایا جس کی روشنی میں موضوعِ کتاب سے متعلق میرے نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔

حارث

"دنیس ویلا"

اے۔ ایم ۱۸، کراچی

مورخہ ۱۵ر جنوری ۱۹۵۲ء

کتبہ انوری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جواب شکوہ

اقبال کے کلام میں "شکوہ" اور "جواب شکوہ" والی نظمیں تاریخی حیثیت کی مالک ہیں لیکن آخرالذکر مسدس کے تقریباً چار بند "بانگِ درا" کے جواب شکوہ میں شامل نہیں کئے گئے۔ علاوہ ازیں اس نظم کے چند اشعار کی ایسی اصلاح ہوئی ہے کہ اصل کے ساتھ کچھ مماثلت باقی نہیں رہی۔

ذیل کے بند "بانگِ درا" کے جواب شکوہ میں نہیں پائے جاتے:۔

جب مئے درد سے ہو خلقت شاعر مدہوش
آنکھ جب خون کے اشکوں سے بنے لالہ فروش
کشورِ دل میں ہوں خاموش خیالوں کے خروش
چرخ سے سوئے زمین شعر کو لاتا ہے سروش
قیدِ دستور سے بالا ہے مگر دل میرا
فرش سے شعر ہوا عرش پہ نازل میرا
جس طرح احمد مختار ہے نبیوں میں امام
اس کی امت بھی ہے دنیا میں امام اقوام

کیا تمہارا بھی نبی ہے وہی آقائے انام
تم مسلمان ہو؟ تمہارا بھی وہی ہے اسلام
اس کی امت کی علامت تو کوئی تم میں نہیں
مے جو اسلام کی ہوتی ہے وہ اس خم میں نہیں

۳۔ کشورِ ہند میں کلیۂ ناکام کا بت
عربستاں میں شفاخانۂ اسلام کا بُت
اور لندن. میں عبادت کدۂ عام کا بُت
لیگ والوں نے تراشا ہے بڑے نام کا بت
بادہ آشام نئے، بادہ نیا خم بھی نئے
یعنی کعبہ بھی نیا بت بھی نئے تم بھی نئے

یہ آخری شعر 'بانگ درا' میں "ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں" والے بند کے ساتھ چسپاں کیا گیا اور مصرع ثانی میں "کعبہ بھی نیا" کی جگہ "حرم کعبہ نیا" نے لے لی۔

۴۔ علمِ حاضر بھی پڑھا زائرِ لندن بھی ہوئے
مثلِ انجم افقِ قوم پہ روشن بھی ہوئے
بے عمل تھے ہی جواں دین سے بدظن بھی ہوئے

صفت طائرِ گم کردہ نشیمن بھی ہوئے
حال ان کا ہمتِ نو اور زبوں کرتی ہے
شب مہ سایہ کی ظلمت کو فزوں کرتی ہے.

اس بند کے پہلے شعر کا پہلا مصرع اور دوسرے شعر کا دوسرا مصرع اور تیسرا شعر تمام تر بانگ درا میں نہیں پائے جاتے۔ اسی طرح "قیس زحمت کش تنہائی صحرا نہ رہے" والے بند کا آخری شعر یہ تھا:-

شوق تحریر مضامیں میں گھلی جاتی ہے
بیٹھ کر پردہ میں بے پردہ ہوئی جاتی ہے

۵ دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی
کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
یعنی ہونے کو ہے کانٹوں سے بیاباں خالی
گُل بر انداز ہے خونِ شہدا کی لالی
پیرہن کیوں فلکِ پیر کا عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سُورج کی افق تابی ہے

ملاحظہ ہوں اس بند کے تیسرے اور پانچویں مصرعے جن کی اصلاح بعد میں اس طرح ہوئی:-

۱ بس وفا کیش سے ہوتا ہے گلستاں خالی

۲ رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنّابی ہے

۶ ختم کاہے کو ہوا کام ابھی باقی ہے

نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

اس شعر کا پہلا مصرع "بانگ درا" میں یوں رقم ہوا ہے "وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے"۔ وغیرہ وغیرہ

۷ ہو نہ افسردہ اگر ہل گئی تعمیر تری

راز توحید حکومت نہیں تفسیر تری

تو وہ سرباز ہے اسلام ہے شمشیر تری

نظم ہستی میں ہے کچھ اور ہی تقدیر تری

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

یہ بند "بانگِ درا" میں "جواب شکوہ" کا آخری بند ہے لیکن کس قدر مختلف

۸ وسعتِ کون و مکاں ساز ہے مضراب ہے یہ

دہر مسجد ہے سراپا خم محراب ہے یہ

جام گردوں میں عیاں مثل مئے ناب ہے یہ

رُوح خورشید ہے خونِ رگ مہتاب ہے یہ

صوت ہے نغمۂ کُن میں تو اسی نام سے ہے
زندگی زندہ اسی نور کے اتمام سے ہے
انجم اس کے فلک اس کے ہیں زمیں اسکی ہے
کیا یہ اغیار کی دنیا ہے؟ نہیں اسکی ہے
سجدے مسجود ہوں جس کے وہ جبیں اسکی ہے
وہ ہمارا ہے ہمیں قوم ہمیں اس کی ہے
طوفِ احمدؐ کے امینوں کا فلک کرتے ہیں
یہ وہ بندے ہیں ادب جن کا ملک کرتے ہیں
مثلِ بو قید ہے غنچہ میں پریشاں ہو جا
رخت بردوش ہوائے چمنستاں ہو جا
شوقِ وسعت ہے تو ذرّے سے بیاباں ہو جا
نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا
بول اس نام کا ہر قوم میں بالا کر دے
اور دنیا کے اندھیرے میں اجالا کر دے

مندرجہ بالا بندوں میں سے بند نمبر ۸ اور ۹ 'بانگ درا' میں شامل نہیں کیے گئے اور بند نمبر ۱۰ ایں

تیسرے مصرع کے "شوق وسعت ہے" کو "ہے تنگ مایہ" میں تبدیل کر دیا گیا۔
اس کے علاوہ اس بند کے آخری شعر کی ایسی اصلاح ہوئی کہ سارے
بند میں جان پڑ گئی۔ شعر یہ ہے :-

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمدؐ سے اُجالا کر دے

اس سلسلہ میں دیگر نمایاں امر یہ ہے کہ اس دور کے جرائد
میں جو "جواب شکوہ" چھپا تھا اس کا آخری بند منقولہ بالا بند تھا۔ مگر 'بانگ درا'
میں یہ ترتیب بدل گئی اور اس بند کے بعد مزید چار بندوں کا اضافہ کر دیا گیا

نیا شوالہ

اقبالؔ کی قومی نظموں میں "ترانۂ ہندی" (سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں
ہمارا) کے بعد "نیا شوالہ" کو ملک کے طول و عرض میں مقبول عام کی
سند حاصل ہوئی۔ لیکن اس نظم کے مندرجہ ذیل دس اشعار
'بانگِ درا' میں نہیں پائے جاتے۔

کچھ فکر پھوٹ کی کر مالی ہے تو چمن کا
بوٹوں کو پھونک ڈالا اس بس بھری ہوا نے
پھر اک انوپ ایسی سونے کی مورتی ہو

اس ہر دوار دل میں لاکر جسے بٹھا دیں

سندر ہو اس کی صورت چھب اس کی موہنی ہو

اس دیوتا سے مانگیں جو دِل کی ہوں مرادیں

زنّار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو

یعنی صنم کدے میں شان حرم دکھا دیں

پہلو کو چیر ڈالیں درشن ہو عام اس کا

ہر آتما کو گویا اِک آگ سی لگا دیں

آنکھوں کی ہے جو گنگا لے لے کے اس سے پانی

اس دیوتا کے آگے اک نہر سی بہا دیں

"ہندوستان" لکھدیں ماتھے پہ اس صنم کے

بھولے ہوئے ترانے دنیا کو پھر سنا دیں

مندر میں ہو بُلانا جس دم پجاریوں کو

آوازۂ اذاں میں ناقوس کو چھپا دیں

اگنی ہے ایک نرگن کہتے ہیں پیت جس کو

دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ میں جلا دیں

ہے ریت عاشقوں کی تن من نثار کرنا

رونا ستم اٹھانا اور ان کو پیار کرنا

ظاہر ہے کہ آخری شعر 'بانگ درا' میں اس طرح نقل کیا گیا ہے :-

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے

دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

مرزا غالب

اس نظم کے تین اشعار کو 'بانگ درا' سے حذف کر دیا گیا ہے۔ دیگر دو اشعار کی ایسی پاکیزہ اصلاح ہوئی ہے کہ اصلیت برقرار ہے مگر اشعار میں مطالب اور معانی کا وافر ذخیرہ جمع ہوگیا ہے۔ محذوف اشعار یہ ہیں :-

معجزہ کلک تصور کا ترا دیواں ہے یہ

یا کوئی تفسیر رمز فطرت انساں ہے یہ

نازش موسیٰ کلامی ہائے ہندوستاں ہے یہ

نور معنی سے دل افروز سخن داناں ہے یہ

"نقش فریادی ہے تیری شوخیٔ تحریر کا"

"کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا"

دید تیری آنکھ کو اس حُسن کی منظور ہے

صورتِ روح رواں ہر شے میں جو مستور ہے

گیسوئے اردو ابھی منّتِ پذیر شانہ ہے

شمع یہ جوئندۂ دل سوزیٔ پروانہ ہے

چوتھے شعر کے مصرع ثانی کی اصلاح یوں کی گئی ہے :-

بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

پانچویں شعر کے دوسرے مصرع میں "جوئندہ" کی جگہ "سودائی" نے لے لی ہے۔

داغ

اس نظم کے مندرجہ ذیل پانچ اشعار 'بانگ درا' میں شامل نہیں کئے گئے :-

جوہر رنگیں نوائی پا چکا جس دم کمال

پھر نہ ہو سکتی تھی ممکن میر و مرزا کی مثال

کر دیا قدرت نے پیدا ایک دونوں کا نظیر

داغ یعنی وصل فکر میرزا و درد میر

شعر کا کاشانہ لیکن آج پھر ویراں ہوا

دیدۂ خوں بار پھر منّت کش داماں ہوا

بلبل دہلی نے باندھا اس چمن میں آشیاں

ہمنوا ہیں سب عنادل باغِ ہستی کے جہاں

کم نہیں محشر سے کچھ ایسی صدا کی خامشی

آہ دل سوزی تو تھی گو نکتہ آموزی نہ تھی

اس نظم کا یہ شعر

اے جہاں آباد اے سرمایۂ بزم سخن

ہو گیا پھر آج پامال خزاں تیرا چمن

ابتدا میں یوں چھپا تھا :-

آہ اے بیت الحرام مذہب اہل سخن

ہو گیا پھر آج پامال خزاں تیرا چمن

"عبد القادر کے نام"

اس نظم کا اصل عنوان "پیام عمل" تھا اور اس کے چار اشعار 'بانگ درا' میں نہیں ملتے

پھونک ڈالا تھا کبھی دفتر باطل جس نے
حدّت دم سے اسی شعلہ کو پیدا کردیں
درد ہے سارے زمانے کا ہمارے دل میں
جنس کمیاب ہے آ نرخ کو بالا کردیں
تن آتش زدۂ شوق کو مانند سرشک
قطع منزل کے لئے آبلہؔ پا کردیں
زاہد شہر کہ ہے سوختہ طبعی میں مثال
خشک ہے اس کو غریق نمِ صہبا کردیں

بلادِ اسلامیہ

اس نظم میں اقبال نے اپنے خونِ جگر سے رنگ آمیزی کی ہے لیکن مندرجہ ذیل دو شعار کو بانگ درا میں درخور اشاعت نہیں سمجھا:-

ذور گر دوں میں نمونے سینکڑوں تہذیب کے
پَل کے نکلے مادرِ ایام کی آغوش سے

خشک لب انسان کو جس نے آب جاں پرور دیا
عقل کو آزاد زنجیر توہم کر دیا
جس نے عہد وصل باندھا مدّت دوراں کے ساتھ
جس نے پوری منصفی کی فطرت انساں کے ساتھ
جس کے ڈر سے وہم کا قصر کہن آئین گرا
گردن انسان سے طوق راہب خود بین گرا
گر مٹانا بستیوں کا ہے شعارِ روزگار
عظمت ملّت کی باقی یادگاریں ہیں ہزار
یہ ہویدا ہے کہیں مٹتے ہوئے آثار میں
یا نمایاں ہے کسی گرتی ہوئی دیوار میں
اُجڑے گورستاں کی خاموشی سے ہم آغوش ہے
شان پیشیں اشک خون قوم سے گُل پوش ہے
نالہ کرتی ہے کہیں خاموش ہوتی ہے کہیں
اہلِ ملّت کی فراموشی کو روتی ہے کہیں
جلوہ گاہیں اس کی ہیں اپنی زیارت کے لئے

اشک باری کے لئے غم کی حکایت کے لئے

صقلیہ (جزیرۂ سسلی)

یہ نظم ابتدا میں صرف "جزیرۂ سسلی" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی اور بلاکم وکاست "بانگ درا" میں شامل کر لی گئی۔ لیکن مندرجہ ذیل اشعار میں کچھ قطع و برید ہوئی :-

۱ یہ محل خیمہ تھا ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
(بانگ درا) تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی

۲ زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
شعلۂ جاں سوز پنہاں جن کی تلواروں میں تھے
(بانگ درا) بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

۳ آفرینش جن کی دُنیائے کہن کی تھی اجل
جن کی ہیبت سے لرز جاتے تھے باطل کے محل

۴ زندگی دنیا کو جن کی شورش قم سے ملی
مخلصی انساں کو زنجیر توہم سے ملی

(بانگ درا) مُردہ عالم زندہ جن کی شورش قم سے ہوَا
آدمی آزاد زنجیر توھم سے ہوَا

۵ جس کے آوازے سے لذّت گیر اب تک گوش ہے
وہ جرس کیا اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

(بانگ درا)۔ غلغلوں سے جس کی لذّت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

۶ مرثیہ تیری تباہی کا مری قسمت میں تھا
یہ تڑپنا اور تڑپانا مری قسمت میں تھا

یہ شعر بانگ درا میں یوں تبدیل ہوَا :-

غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم تیرا — چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم تیرا

"نمودِ صبح"

گو بانگ درا میں یہ نظم صرف ۹۔ اشعار پر مشتمل ہے مگر ابتداء میں اس میں ۳۸۔ اشعار تھے۔ اس کا عنوان تھا "حیدرآباد دکن" یا طلوع سحر"۔ بانگ درا کیلئے اقبال نے اس نظم کے پہلے ۹ اشعار منتخب کئے اور باقی ۲۹ اشعار کو شامل

نہیں فرمایا ان اشعار میں وہی دل کشی اور جاذبیت پائی جاتی ہے جو خیالات و احساسات کے اعتبار سے پہلے شعروں میں ہے۔

گرچہ قدرت نے مجھے افسردہ دل پیدا کیا
آنکھ وہ بخشی کہ ہے نظارہ آشام بہار

کھینچ کر سوئے گلستاں لے گیا ذوق نظر
عاشق فطرت کو ہے صحن گلستاں کوئے یار

گل نے بلبل سے کہا لے ہم صفیر آیا ترا
کہتی تھی بلبل کہ اے مقصود چشم انتظار

اتنے دن غائب رہا تو گلشن پنجاب سے
کر لیا تھا کیا کسی صیاد نے تجھ کو شکار

کس سے کہتے راز اپنا لالہ ہائے شعلہ پوش
کس پہ کرتے درد دل اپنا عنادل آشکار

پوچھتی تھی روز مجھ سے نرگس شبنم فریب
ہو گیا غائب کہاں اپنے چمن کا رازدار

پھول فرقت میں تری سوزن بہ پیراہن رہے
دیدۂ قمری میں تھا صحن گلستاں خارزار

غنچۂ نوخیز کو یہ کہہ کے بہلاتی تھی میں
ہے یہیں پوشیدہ وہ وارفتۂ فصل بہار

کچھ تو کہہ ہم سے بھی اس وارفتگی کا ماجرا
لے گیا تجھ کو کہاں تیرا دِل بے اختیار
کِس تجلّی گاہ نے کھینچا ترا دامانِ دِل
تیری مشتِ خاک نے کِس دیس میں پایا قرار
کیا کہوں اس بوستانِ غیرتِ فردوس کی
جس کے پھولوں میں ہوَا اے ہمنوا میرا گزر
جس کے ذرّے مہرِ عالمتاب کو سامانِ نور
جس کی طورافروزیوں پر دیدۂ موسیٰ نثار
خطّۂ جنّت، فضا جس کی ہے دامن گیر دل
عظمتِ دیرینۂ ہندوستاں کی یادگار
جس نے اسمِ اعظمِ محبوب کی تاثیر سے
وسعتِ عالم میں پایا صورتِ گردوں وقار
نور کے ذرّوں سے قدرت نے بنائی یہ زمیں
آئینہ پٹکے دکن کی خاک اگر پائے فشار
آستانے پر وزارت کے ہوَا میرا گذر
بڑھ گیا جس سے مرا ملکِ سخن میں اعتبار

اس قدر حق نے بنایا اس کو عالی مرتبت
آسماں اس آستانہ کی ہے اک موجِ غبار

کی وزیرِ شاہ نے وہ عزت افزائی مری
چرخ کے انجم مری رفعت پہ ہوتے تھے نثار

مسند آرائے وزارت راجۂ کیواں حشم
روشن اُس کی رائے روشن سے نگاہِ روزگار

اس کی تقریروں سے رنگیں گلستانِ شاعری
اس کی تحریروں پہ نظمِ مملکت کا انحصار

لیلیٰ معنی کا محل اس کی نثر دل پذیر
نظم اس کی شاہدِ رازِ ازل کی پردہ دار

سلسلہ اس کی مروت کا یوں ہی لاانتہا
جس طرح ساحل سے عاری بحرِ ناپیدا کنار

دل ربا اُس کا تکلم، خلق اُس کا عطرِ گل
غنچۂ گل کے لئے موجِ نفس بادِ بہار

ہو خطا کاری کا ڈر، ایسے مدبر کو کہاں

جس کی ہر تدبیر کی تقدیر ہو آئینہ دار

ہے یہاں شانِ امارت پردہ دارِ شانِ فقر

خرقہ درویشی کا ہے زیرِ قبائے زرنگار

خاکساری جوہر آئینہ عظمت بنی

دست وقفِ کارفرمائی و دل مصروفِ یار

نقش وہ اس کی عنایت نے مرے دل پر کیا

محو کر سکتا نہیں جس کو مرورِ روزگار!

شکریہ احسان کا اے اقبالؔ لازم تھا مجھے

مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

قطعہ

اس قطعہ کے مندرجہ ذیل دو اشعار "بانگ درا" کے صفحات میں نہیں ملتے اور ایک مصرع میں اس قدر تغیر واقع ہوا ہے کہ اصل کے ساتھ کچھ مشابہت نظر نہیں آتی۔

غریب، تہذیب نو میں آکر جنہوں نے اپنا شعار چھوڑا

جہان کی رہ گزر میں پامال صورتِ نقشِ پا رہے ہیں

بتائیں کیا زندگی گزرتی ہے ہند کے بتکدے میں کیسی

قتیل جور و جفا رہے ہیں شہید ناز و ادا رہے ہیں

غضب ہیں یہ مرشدانِ خود بیں، خدا تری قوم کو بچائے

مسافرانِ حرم کو ظالم رہِ کلیسا بتا رہے ہیں

یہ آخری مصرعہ "بانگ درا" میں یوں ملتا ہے

بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں

بلالؓ

اس نظم کے تین اشعار "بانگ درا" میں نہیں پائے جاتے۔
اشعار یہ ہیں۔

سنم ہے شوق کی آتش کو مثلِ موج ہوا

خدا بھلا کرے آزار دینے والوں کا!

ترے نصیب سا آخر چمک گیا اختر

علی کے سینے میں جو راز تھا کھلا تجھ پر

نماز عشق حسین حجاز ہے گویا!

یہی نماز خدا کی نماز ہے گویا!

والدہ مرحومہ کی یاد میں

اس نظم میں شاعر عالی خیال کی طبع گوہر ریز نے فلسفہ موت اور حیات بعد ممات کی تصویر کھینچی ہے جس کی نظیر کسی اور زبان کی شاعری میں ملنی مشکل ہے اس طویل نظم کے گیارہ اشعار جو "بانگ درا" میں شامل نہیں ہیں یہاں نقل کئے جاتے ہیں ان میں خیالات کی گہرائی اور فلسفہ کا وہی عمق پایا جاتا ہے جو باقی دوسرے اشعار میں آجا کر ہے۔

اپنی نادانی پہ انساں کس قدر آسودہ ہے

تہمت تاثیر سے موجِ نفس آلودہ ہے

زندگی کی رہ میں میں جب طفلِ نو رفتار تھا

جادۂ خوابیدہ ہر ہر گام پر دشوار تھا

قطع تیری ہمت افزائی سے یہ منزل ہوئی

میری کشتی بوسہ گستاخ لب ساحل ہوئی

وہ قوی فطرت کہ ہے جس کی طبیعت استوار
جس کے دل سے کانپتے ہیں حادثاتِ روزگار

(اپنے بھائی کے متعلق)

ہم سمجھتے ہیں ثباتِ زندگی پیکر سے ہے
پیکروں کی بے ثباتی حورِ پیکر گر سے ہے

خامِ فکری سے شفق خونِ سحر سمجھی گئی!
صبح شبنم سے بیاضِ چشمِ تر سمجھی گئی

دیکھنے میں گرچہ ہے مثلِ شرر اُن کا فروغ
خندہ زن ہے صرصرِ ایام پر اُن کا فروغ

کیسی حجت خیز ہے ظلمت فروشی رات کی
دن کے ہنگاموں کا ہے مدفن خموشی رات کی

ظلمتِ آشفتہ کاکل وسعتِ عالم میں ہے
اشکِ انجم درگریباں روز کے ماتم میں ہے

طفلکِ شش روزۂ کون و مکاں خاموش ہے
رات کے آغوش میں لیٹا ہوا بے ہوش ہے

آب دریا خفتہ ہے موج ہوا خش کردہ ہے

پست ہر ہستی کے ساز زندگی کا پردہ ہے

ایک آرزو

اس نظم میں فطرت کی جو عکاسی کی گئی ہے اور اتحاد و اتفاق کا جو سبق پنہاں ہے وہ ان دو اشعار اور منسلکہ بند سے بھی ظاہر ہے۔ مگر یہ بند اور یہ اشعار "بانگ درا" سے خارج کر دیئے گئے ہیں

پچھم کو جا رہا ہو کچھ اس ادا سے سورج

جیسے کوئی کسی کے دامن کو کھینچتا ہو

ظلمت جھلک رہی ہو اس طرح چاندنی میں

جوں آنکھ میں سحر کی سرمہ لگا ہوا ہو

بند

شمشاد گل کا بیری، گل یاسمن کا دشمن

ہو آشیاں کے قابل یہ وہ چمن نہیں ہے

اپنوں کو غیر سمجھوں اس سرزمیں میں رہکر
میں۔بے وطن ہوں میرا کوئی وطن نہیں ہے

وہ مے نہیں کہ جس کی تاثیر تھی محبّت!
ساقی نہیں وہ باقی وہ انجمن نہیں ہے

در محفلے کہ یاراں شرب مدام کردند
نوبت بما چو آمد آتش بجام کردند

شمع

یہ نظم دراصل چالیس اشعار پر مشتمل تھی اور "مخزن" میں بلاکم وکاست شائع ہوئی تھی۔ لیکن اس کے دس اشعار "بانگِ درا" کی زینت نہ بن سکے اور ایک مصرع میں اصلاح کردی گئی۔

اِن اشک باریوں میں طہارت کا راز ہے
کیسا وضو ہے یہ کہ سراپا نماز ہے!!

ایذا پسند ہے دل اندوہ گیں ترا
کیا تجھ پہ رازِ غم کدۂ دہر کھُل گیا

سمجھے کہ خامشی ہے مآل ضیائے شمع
اے وائے گفتگوئے لب بے صدائے شمع

یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بے قرار
خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتش کدے ہزار

یہ امتیاز رفعت و پستی اِسی سے ہے
خوشبو ہے گُل میں بادہ میں مستی اسی سے ہے

بستان و بلبل و گُل و بو ہے یہ آگہی
اصل نظارۂ من و تو ہے یہ آگہی

آزاد دست بردِ بقا و فنا ہوں میں
کُشتہ ہو یہ شرار تو کیا جانے کیا ہوں میں

جوں نے کمند نالۂ دل میں اسیر ہوں
فرقت میں نیستاں کی سراپا نفیر ہوں

محمود۔ اپنے آپ کو سمجھا ایاز ہے

کیا غفلت آفریں یہ مے خانہ ساز ہے
دل خار زار کم نگہی میں اُلجھ نہ جائے
ڈرتا ہوں کوئی میری فغاں کو سمجھ نہ جائے
تو جل رہی ہے اور تجھے کچھ خبر نہیں
دانائے بے قرارئ محشر اثر نہیں !

بانگ درا میں دوسرا مصرع یوں شائع ہوا ہے۔

بینا ہے اور سوز دروں پر نظر نہیں

صدائے درد

"بانگِ درا" کی "صدائے درد" میں کُل نو اشعار ہیں۔ لیکن اصل نظم کافی طویل اور ۲۵، اشعار پر مشتمل تھی جو شاعر کی دلی گہرائیوں کے آئینہ دار ہیں۔

پھر بُلا لے مجھکو اے صحرائے وسط ایشیا
آہ اس بستی میں اب میرا گذارہ ہو چکا
پار لے چل مجھکو پھر اے کشتئ موجِ اٹک

اب نہیں بھاتی یہاں کے بوستانوں کی مہک

ہاں سلام اے مولدِ بو ذاسف گوتم تجھے

اب فضا تیری نظر آتی ہے نامحرم مجھے

الوداع اے سیرگاہِ شیخ شیراز الوداع

اے دیارِ بالمیک نکتہ پرداز الوداع

الوداع اے مدفن ہجویریؒ اعجاز دم

رخصت اے آرام گاہ شنکرِ حبادد رقم

الوداع اے سرزمین نانک شیریں بیان

رخصت اے آرام گاہِ چشتیؒ عیسیٰ نشاں

رمزِ الفت سے مرے اہلِ وطن غافل ہوئے

کارزارِ عرصۂ ہستی کے ناقابل ہوئے

اپنی اصلیت سے ما واقف ہیں کیا انسان ہیں

غیر اپنوں کو سمجھتے ہیں عجب نادان ہیں

جس کا اک مدت سے دھڑکا تھا وہ دن آنے کو ہے

صفحۂ ہستی سے اپنا نام مٹ جانے کو ہے

دل حزیں ہے جان رہن رنج بے اندازہ ہے
آہ اک دفتر تھا اپنا وہ بھی بے شیرازہ ہے

امتیاز قوم و ملت پر مٹے جاتے ہیں یہ
اور اس الجھی ہوئی گتھی کو سلجھاتے ہیں یہ

ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی
کچھ اسی کے دم سے قائم شان ہے انسان کی

روح کا جو بن نکھرتا ہے اِسی تدبیر سے
آدمی سونے کا بن جاتا ہے اس اکسیر سے

رنگِ قومیت مگر اس سے بدل سکتا نہیں
خون آبائی رگِ تن سے نکل سکتا نہیں!

اصل محبوبِ ازل کی ہیں یہ تدبیریں سبھی
اک بیاض نظمِ ہستی کی ہیں تصویریں سبھی.

ایک ہی شے ہے اگر ہر چشمِ دل مخمور ہے
یہ عداوت کیوں ہماری بزم کا دستور ہے

اے ہمالہ تو چھپالے اپنے دامن میں مجھے

ہے غضب کی بے کلی اپنے نشیمن میں مجھے
مدتیں گذری ہیں مجھ کو رنج و غم سہتے ہوئے
شرم سی آتی ہے اب اس کو وطن کہتے ہوئے

آہ، ویرانی ہے پنہاں یاں کی ہر تعمیر میں
آشیاں اور اس گلستانِ خزاں تاثیر میں
آشیاں ایسے گلستاں میں بناؤں کس طرح
اپنے ہم جنسوں کی بربادی کو دیکھوں کس طرح

تصویرِ درد

یہ پُردرد قومی نظم انجمن حمایت الاسلام لاہور کے انیسویں[19] سالانہ جلسہ میں ایک مجمع کثیر کے سامنے پڑھی گئی۔ حاضرین جلسہ نے نہایت شوق اور ذوق کے ساتھ اس کو سُنا اور بے حد داد دی اس میں کل دس بند تھے۔ مگر "بانگ درا" میں اشاعت کے لیے صرف آٹھ بندوں کا انتخاب ہوا اور اس میں بھی کافی قطع بُرید کی گئی محذوف اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

ہوتی ہے سرمۂ آواز گو لذت خموشی کی

نگہ بن بن کے آنکھوں سے نکلتی ہے فغاں میری

میری حیرت روانی سوز ہے اس درجہ اے ساقی
کہ مینا بن گئی آخر شرابِ ارغواں میری

شکارِ خوف رسوائی ہے میری نو گرفتاری
کسی صورت ہو یارب ساری دنیا رازداں میری

شکایت آسماں کی میرے لب پر آ نہیں سکتی
کہ میں قسمت کا مارا آپ ہی اپنی مصیبت ہوں

مری ہستی نے آلودہ کیا دامانِ عصیاں کو
وہ عاصی ہوں کہ میں اپنے گناہوں کی ندامت ہوں

مرے طوفِ جبیں کو اڑ کے خاکِ آستاں آئی
میں وہ درماندۂ دامانِ صحرائے عبادت ہوں

سیہ کاری مری زاہد سے کہتی ہے یہ محشر میں
سبھی کچھ ہوں مگر ہم رنگ محرابِ عبادت ہوں

مری ہستی نہیں وحدت میں کثرت کا تماشہ ہے

کہ خود عاشق ہوں، خود معشوق ہوں خود دردِ فرقت ہوں

وضو کے واسطے آتا ہے کعبہ لے کے زمزم کو

الٰہی کون سی وادی میں میں محوِ عبادت ہوں

نہ چھُپ او کاٹنے والے مجھے میرے نیستاں سے

سراپا صورتِ نے تیری فرقت کی شکایت ہوں

نجف میرا مدینہ ہے، مدینہ ہے مرا کعبہ

میں بندہ اور کا ہوں اُمت شاہِ ولایت ہوں

جو سمجھوں اور کچھ خاک عرب میں سونے والے کو

مجھے معذور رکھ، میں مستِ صہبائے محبت ہوں

یہی صہبا ہے جو رفعت بنا دیتی ہے پستی کو

اسی صہبا میں آنکھیں دیکھتی ہیں رازِ ہستی کو

شرابِ عشق میں کیا جانے کیا تاثیر ہوتی ہے

کہ مشتِ خاک جس سے رو کش اکسیر ہوتی ہے

ر، وہ مے ہے تکلم بن کے رہتی ہے زبانوں میں

نگاہوں میں مثالِ سرمۂ تسخیر ہوتی ہے

ابان میری ہے لیکن کہنے والا اور ہے کوئی

مری تقریر گویا اور کی تقریر ہوتی ہے

بس اے ذوقِ خموشی رخصتِ فریاد دے مجکو

کہ چپ بیٹھوں تو گویائی گریباں گیر ہوتی ہے

ز ایسا کیا ہے دل یہ تاراج گلستان نے

مجھے پرواز رنگِ گل صدائے تیر ہوتی ہے

سنا ہے میں نے جو کچھ اہلِ محفل کو سناتا ہوں

خموشی بے محل مثلِ دمِ شمشیر ہوتی ہے !

عکس کا آئینہ باندھا ہے میں نے اپنی آہوں میں

مری ہر بات میرے درد کی تصویر ہوتی ہے

ود اپنے آنسوؤں میں رونے والا چھپ کے بیٹھا ہو

صدائے نالۂ دل کی یہی تاثیر ہوتی ہے

تمیزِ ما و من ہوتی نہیں حرفِ محبت میں

مثالِ خامشی گویا مری تقریر ہوتی ہے

سُنے ہیں اہلِ محفل نے فسانے حال و ماضی کے

مرے نالوں میں استقبال کی تفسیر ہوتی ہے

بُرا ہوں یا بھلا ہوں میرا کہنا سب کو بھاتا ہے

وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

ہوائے امتیازِ ملت و آئین کی موجوں نے

غضب کا تفرقہ ڈالا ترے خرمن کے دانوں میں

جہاں خوں ہو رہا ہے کارزارِ زندگانی سے

مئے غفلت کے ساغر چل رہے ہیں نوجوانوں میں

تغیر اس طرح کا محفلِ ہستی میں آیا ہے

کہ ہے چپ بیٹھ رہنا بھی تباہی کے نشانوں میں

مزا دیتا نہیں کچھ صورتِ گُل صد زباں ہونا

زباں جب ایک بھی گویا نہ ہو اتنی زبانوں میں

ہوا پیکار کی آخر اجاڑے گی گلستاں کو

خدا رکھے یہ ہے اپنے پرانے مہربانوں میں

قیامت ہی کہ ہر ذرّہ سے پیدا سو مصیبت ہے

زمیں بھی اپنی شاید جا ملی ہے آسمانوں میں

اُڑا لے جائیگی موج ہوائے نیستی ان کو

نہ ہو جب راہ پیمائی کی طاقت ناتوانوں میں

رلایا خوں مری آنکھوں کو تیرے خواب غفلت نے

مری تقدیر میں لکھا تھا رونا کلک قدرت نے

دکھا دوں گا میں اے ہندوستاں رنگِ وفا سب کو

کہ اپنی زندگانی تجھ پہ قرباں کر کے چھوڑوں گا

نہیں بے وجہ وحشت میں اڑانا خاک زنداں کا

کہ میں اس خاک سے پیدا بیاباں کر کے چھوڑوں گا

شریک محنت زنداں ہوں گو یوسف صفت خود بھی
مگر تعبیر خواب اہلِ زنداں کر کے چھوڑوں گا

ابھی مجھ دل جلے کو ہم صفیرو اور رونے دو
کہ میں سارے چمن کو شبستاں کر کے چھوڑوں گا

تعصب نے مری خاک وطن میں گھر بنایا ہے
وہ طوفاں ہوں کہ میں اس گھر کو ویراں کر کے چھوڑونگا

اگر آپس میں لڑنا آج کل کی ہے مسلمانی
مسلمانوں کو آخر نا مسلماں کر کے چھوڑوں گا

اٹھادوں گا نقاب عارضِ محبوب یک رنگی
تجھے اس خانہ جنگی پر پشیماں کر کے چھوڑوں گا

جو تیرا درد تھا تا کا ہے اس نے میرے پہلو کو
تری افتاد نے توڑا ہے میرے دست و بازو کو

اڑا کر لے گئی لذت تجھے آوارہ رہنے کی
چمن میں کچھ نہ دیکھا صورت باد صبا تو نے

تری تعمیر میں مضمر ہوئی افتادگی کیونکر
لگائی ہے مگر اس گھر کو خشتِ نقشِ پا تو نے

تلاشِ تکمۂ اخگر سے پیدا ہے جنوں تیرا
جو پہنی صورتِ تصویر کاغذ کی قبا تو نے

سبق لیتا رہا افتادگی کا خاکِ ساحل سے
نہ سیکھا موجِ دریا سے علاجِ خوابِ پا تو نے

نہیں ہے دہریت کیا بندۂ حرص و ہوا ہونا
قیامت ہے مگر اوروں کو سمجھا دہریا تو نے

وہ حُسنِ عالم آرا تیرے دل میں جلوہ گستر تھا
غضب ہے آسمانوں میں دیا اس کا پتا تو نے

نہیں ممکن شناسائی ہو تجھ کو رمزِ وحدت سے
صدائے غیر سمجھا جب سُنی اپنی صدا تو نے

نظر اس دَور میں مجھ کو ترا جینا نہیں آتا
کہ صہبائے محبّت کا تجھے پینا نہیں آتا

پکڑ کر عجز کا دامن پہنچ عرش معلےٰ پر
نگاہوں کو نظر اس بام کا زینا نہیں آتا

یہیں بے نور رہے محشر میں تو کیا خاک دیکھے گا
کہ تجھ کو دیکھنا اے دیدۂ بینا نہیں آتا

یہ بہتر تھا کہ تو اے شیشۂ دل چور ہو جاتا
صفا رہنا تجھے مانند آئینا نہیں آتا

اکارت ہے بناوٹ سے ترا رونا نمازوں میں
کہ ہاتھ اس طرح وہ پوشیدہ گنجینا نہیں آتا

بنا آنکھوں کو جامِ اشک دل کو دردکی مینا
مزا جینے کا کچھ بے ساغر و مینا نہیں آتا

بجھا دینا ہی اچھا ہے، چراغِ زندگانی کا
محبت میں جو مر مر کے تجھے جینا نہیں آتا

بنا اس راہ میں ذوق طلب کو ہم سفر اپنا
اکیلے لطف سیر وادیٔ سینا نہیں آتا

تلاشِ خضر کب تک تشنۂ زہرِ محبت ہو

جسے مرنا نہیں آتا اسے جینا نہیں آتا

نمی گویم قیامت جوش زن یا شورِ طوفاں شو
زطوفاں دست بردار آنچہ نتوانی شدن آں شو

تبسم سے غرض ہے پردہ داری چشمِ گریاں کی
چھپا کر بیٹھ صبحِ عید میں شامِ محرم کو

جمالِ یوسفِ یثرب کو دیکھ آئینۂ دل میں
نہ ڈھونڈ اے دیدۂ حیراں نمودِ ابنِ مریم کو

شفا دیکھی ہے بیماری میں کیا ان دردمندوں نے
کہ بے حاصل سمجھتے ہیں تلاشِ ابنِ مریم کو

خدا جانے یہ بندے کونسی آتش میں جلتے ہیں
کہ خاکستر کی ایک مٹھی سمجھتے ہیں جہنّم کو

عقل و دل

یہ نظم "خطِ منظوم" کے عنوان سے — پیغام بیعت کے جواب میں — ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ اشعار کی کُل تعداد چالیس ۴۰ تھی۔ مگر "بانگِ درا" میں صرف تیرہ ۱۳ اشعار درج ہیں۔

خضر سے چھپ کے مر رہا ہوں میں
تشنہ کامِ مئے فنا ہوں میں

ہمکلامی ہے غیریت کی دلیل!
خامشی پر مٹا ہوا ہوں میں

کانپ اٹھتا ہوں ذکرِ مرہم پر!
وہ دلِ دردآشنا ہوں میں

تنکے چُن چُن کے باغِ اُلفت کے
آشیانہ بنا رہا ہوں میں

گل پژمردۂ چمن ہوں مگر
رونقِ خانہ صبا ہوں میں

کارواں سے نکل گیا آگے
مثلِ آوازۂ درا ہوں میں

دستِ واعظ سے آج بنکے نماز
کس ادا سے قضا ہوا ہوں میں

مجھ سے بیزار ہے دلِ زاہد
دیدۂ حور کی حیا ہوں میں؟

ہے زباں مائلِ ترانۂ شوق
سُننے والوں کو دیکھتا ہوں میں

میں نے مانا کہ بے عمل ہوں مگر
رمزِ وحدت سے آشنا ہوں میں

پردۂ میم میں رہے کوئی
اس بھلاوے کو جانتا ہوں میں

سب کسی کا کرم ہے یہ ورنہ
کیا میرا شوق اور کیا ہوں میں

میں کسی کو بُرا کہوں! توبہ!
ساری دنیا سے خود برا ہوں میں

جام ٹوٹا ہوا ہوں میں لیکن
مئے حق سے بھرا ہوا ہوں میں

ایک دانے پہ ہے نظر تیری
اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں

تو جدائی پہ جان دیتا ہے
وصل کی راہ سوچتا ہوں میں

بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے
اس عبادت کو کیا سراہوں میں

بت پرستی تو ایک مذہب ہے
کفر غفلت کو جانتا ہوں میں

مرگ اغیار پہ خوشی ہے تجھے
اور آنسو بہا رہا ہوں میں

میرے رونے پہ ہنس رہا ہے تو
تیرے ہنسنے کو رو رہا ہوں میں

علم پلتا ہے میری گودی میں
رازِ ہستی سے آشنا ہوں میں

میرے دم سے جہان بستا ہے
اس اندھیرے میں چاند نا ہوں میں

گلشنِ طور ہے بہار میری
قطرۂ بحرہ آشنا ہوں میں

تو ہے وابستۂ زمان و مکاں
اور اس قید سے رہا ہوں میں

ہائے یہ دل ہو میرے پہلو میں　　تو یہ سمجھے کہ دہریا ہوں میں
اہلِ دل کو بگاڑ سے مطلب؟　　سب بزرگوں کی خاکِ پا ہوں میں
فیض اقبال ہے اسی در کا
بندۂ شاہ لافتا ہوں میں

نالۂ یتیم

یہ نظم انجمن حمایت الاسلام (لاہور) کے پندرھویں سالانہ جلسے میں پڑھی گئی۔ اس نظم پر حاضرین نے اشک افشانی کے ساتھ ساتھ زرفشانی بھی خوب کی۔ یہ نظم "بانگِ درا" میں نہیں ملتی۔

آہ! کیا کہیے کہ اب پہلو میں ایسا دل نہیں!
بجھ گئی جب شمع روشن۔ درخور محفل نہیں
اے مصاف نظم ہستی میں ترے قابل نہیں!
ناامیدی جسکو طے کرے یہ وہ منزل نہیں
ہائے کس منہ سے شریکِ بزم میخانہ ہوں میں

ٹکڑے ٹکڑے جس کے ہو جائیں وہ پیمانہ ہوں میں

خارِ حسرتِ غیرتِ نوک سناں ہونے لگا

یوسفِ غم زینتِ بازارِ جاں ہونے لگا

دِل مرا شرمندۂ ضبطِ فغاں ہونے لگا

نالۂ دل روشناسِ آسماں ہونے لگا

کیوں نہ وہ نغمہ صدائے رشکِ صد فریاد ہو

جو سرودِ عندلیبِ گلشنِ برباد ہو

پنجۂ وحشت بڑھا چاکِ گریباں کے لئے

اشکِ غم ڈھلنے لگے پابوسِ داماں کے لئے

مضطرب ہے یوں دلِ نالاں بیاباں کیلئے

جس طرح بُلبُل تڑپتا ہے گلستاں کے لئے

لیں گے ہم ہنگامۂ ہستی میں اب کیا بیٹھ کر

روئیے جا کر کسی صحرا میں تنہا بیٹھ کر

قابلِ عشرتِ دل خوردۂ حسرت نہیں

درخورِ بزمِ طرب شمعِ سرِ تربت نہیں

زیرِ گردوں شاہدِ آرام کی صورت نہیں
غیرِ حسرت غازۂ رخسارۂ راحت نہیں

صبحِ عشرت بھی ہماری غیرتِ صد شام ہے
ہستیٔ انساں غبارِ خاطرِ آرام ہے

ہے قیام بحرِ ہستی جزر و مدِ امیّد کا
گاہے گاہے آنکلتی ہے مسرّت کی ہوا

زندگی کو نورِ الفت سے ملی جس دم ضیا
لے کے طوفانِ ستم ابرِ تغیّر آ گیا

ہے کسی کو کامِ دل حاصل کوئی ناکام ہے!
اس نظارہ کا مگر خاک لحد انجام ہے!

اے فلک تجھ سے تمنّائے سعادت پروری
ہر ستارہ ہے ترا داغِ دلِ نیک اختری

تو نے رکھا ہے کسے حرماں نصیبی سے بری!
اے مسلمانان فغاں از دورِ چرخِ چنبری

یاری اندر کس نمی بینیم یاراں را چہ شد!

دوستی گو آخر آمد دوست داراں راچہ شد

نطق کرسکتا نہیں کیفیت غم کو عیاں !
اس کی تیزی کو مٹا دیتے ہیں اندازِ بیاں

آنہیں سکتی زباں تک رنج وغم کی داستاں
خندہ زن میرے لبِ گویا پہ ہے دردِ نہاں

عجز گویائی ہے گویا حکم قید خامشی
مجرم اظہار غم کو یہ سزا ملنے لگی !

زخمِ دل کے واسطے ملتا نہیں مرہم مجھے!
اپنی قسمت کا ہے رونا صورتِ آدم مجھے

ظلّ دامانِ پدر کا ہے زلیس ماتم مجھے
ہاں! ڈبو دے! اے محیطِ دیدۂ پُرنم مجھے

مضطرب اے دل نہ ہونا ذوقِ طفلی کے لئے
تو بنا ہے تلخیٔ اشک یتیمی کے لئے

سایۂ رحمت ہے تو اے ظلِّ دامانِ پدر
غنچۂ طفلی پہ ہے مثل صبا تیرا گذر

رہنما ہے وادیٔ عالم میں تو مثلِ خضر

تو تو ہے اک مظہر شانِ کریمی سر بسر

ہے شہنشاہی جو طفلی تو ہُما تاثیر ہے

تو نہ ہو تو زندگی اک قیدِ بے زنجیر ہے

عین طفلی میں ہلال آسا کمر خم کھا گئی

صبح پیری کی نگہ بن کر یتیمی آ گئی

یادِ دنا کامی اسے کیا جانے کیا سمجھا گئی

شعلۂ سوزِ الم کو اور بھی بھڑکا گئی

دم کے بدلے میرے سینے میں دمِ شمشیر ہے

زندگی اپنی کتابِ موت کی تفسیر ہے

جوششِ صرصر سے ہے اے بحر جولانی تری

اور قمر کے دم سے ہے ساری یہ طغیانی تری

کوہ و دریا سے ہے قائم شانِ سلطانی تری

اور شعاعِ مہر سے ہے خندہ پیشانی تری

نظمِ عالم میں نہیں موجود سازِ بے کسی

ہو گئی پھر کیوں یتیمی صید باز بے کسی

کھینچ سکتا ہے مصوّر خندۂ گل کا سماں

اور کچھ تمثیل نہیں اے برق تیری شوخیاں

صبح کا اختر نہیں کلک تصوّر پر گراں

اور ہی کچھ ہیں مگر میرے تبسم کے نشاں

یہ تبسّم اشک حسرت کا نمک پروردہ ہے

درد پنہاں کو چھپانے کے لئے اک پردہ ہے

یادِ ایّام سلف! تو نے مجھے تڑپا دیا

آہ! اے چشم تصوّر تو نے کیا دکھلا دیا

اے فراقِ رفتگاں تو نے یہ کیا سمجھا دیا

درد پنہاں کی خلش کو اور بھی چمکا دیا

رہ گیا ہوں دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر

کچھ مداوا اس مرض کا اے دلِ ناکام کر

آمد بوئے نسیم گلشنِ رشکِ ارم

ہو نہ مرہونِ سماعت جس کی آوازِ قدم

لذّتِ رقص شعاعِ آفتابِ صبح دم
یا صدائے نغمۂ مُرغِ سحر کا زیر و بم

رنگ کچھ شہرِ خموشاں میں جما سکتی نہیں
خفتگانِ کنجِ مرقد کو جگا سکتی نہیں

ہر گھڑی اے دل! نہ یوں اشکوں کا دریا چاہئے
داستاں جیسی ہو ویسا سننے والا چاہئیے

ہر کسی کے پاس یہ دکھڑا نہ رونا چاہئے
آستاں اس کو یتیم ہاشمی کا چاہئے

چشمِ باطن کی نظر بھی کیا سبک رفتار ہے
سامنے اک دم میں درگاہِ شہِ ابرار ہے

اے مددگارِ غریباں! اے پناہِ بیکساں!
اے نصیرِ عاجزاں! اے مایۂ بے مائگاں

کارواں صبر و تحمل کا ہو اول سے رواں
کہنے آیا ہوں میں اپنے درد و غم کی داستاں

ہے تری ذاتِ مبارک حلّ مشکل کے لئے

نام ہے تیرا شفا دکھّے ہوئے دل کیلئے
بیکسوں میں تابِ جورِ آسماں ہوتی نہیں
ان دلوں میں طاقتِ ضبطِ فغاں ہوتی نہیں
کون وہ آفت ہے جو رہنِ بیاں ہوتی نہیں
اک یتیمی ہے کہ ممنونِ زباں ہوتی نہیں
میری صورت ہی کہانی ہے دلِ ناشاد کی
ہے خموشی بھی مری سائل تری امداد کی
بزمِ عالم میں طرازِ مسندِ عظمت ہے تو
بہرِ انساں جبرئیلِ آیۂ رحمت ہے تو
اے دیارِ علم و حکمت قبلۂ اُمّت ہے تو
اے ضیائے چشمِ ایماں زیبِ ہر مدحت ہے تو
درد جو انساں کا تھا وہ تیرے پہلو سے اُٹھا
قلزمِ جوشِ محبّت تیرے آنسو سے اُٹھا
آبِ کوثر تشنہ کامانِ محبت کا ہے تو
جس کے ہر قطرے میں سو موتی ہوں وہ دریا ہے تو
طور پر چشمِ کلیم اللہ کا تارا ہے تو
معنیٔ یٰسین ہے تو۔ مفہومِ اَو ادنیٰ ہے تو
اُس نے پہچانا نہ تیری ذات پر انوار کو

جو نہ سمجھا احمدؐ بے میم کے اسرار کو

دلربائی میں مثالِ خندۂ مادر ہے تو

مثل آوازِ پدر شیریں ترا کوثر ہے تو

جس سے تاجِ عرش کو زینت ہو وہ گوہر ہے تو

از پئے تقدیرِ عالم صورتِ اختر ہے تو

زیبِ حسنِ محفلِ اشرافِ عالم تو ہوا

تھی مؤخر گرچہ آمد پر مقدم تو ہوا

تیرا رتبہ جوہرِ آئینۂ لولاک ہے

فیض سے تیرے رگِ تاکِ یقیں نمناک ہے

تیرے سائے سے منور دیدۂ افلاک ہے

کیمیا کہتے ہیں جس کو تیرے در کی خاک ہے

تیرے نظارے کا موسیٰ میں کہاں مقدور ہے

تو ظہورِ لن ترانی گوئے اوجِ طور ہے

دوپہر کی آگ میں وقتِ درو دہقان پر!

ہے پسینے سے نمایاں مہرِ تاباں کا اثر

جھلکیاں اُمید کی آتی ہیں چہرے پر نظر

کاٹ لیتا ہے مگر جس وقت محنت کا ثمر

یا محمدؐ! کہہ کے اٹھتا ہے وہ اپنے کام سے
ہائے کیا تسکیں اسے ملتی ہے تیرے نام سے

وہ پناہِ دینِ حق وہ دامنِ غارِ حرا
جو ترے نیضِ قدم سے غیرتِ سینا ہوا

وہ حصارِ عافیت وہ سلسلہ فاران کا
جس کے ہر ذرّے سے اٹھی دینِ کامل کی صدا

فخر پابوسی سے تیری آسماں سا ہو گئی
یہ زمیں ہمپایۂ عرشِ معلّٰے ہو گئی

نظمِ قدرت میں نشاں پیدا نہیں بیداد کا
شکوہ کرنا کام ہوتا ہے دلِ ناشاد کا

آگرا ہوں تیرے در پر وقت ہے امداد کا
سرفرازی چاہیئے بدلہ مری افتاد کا

آ نہ سکتا تھا زباں تک بیکسی کا ماجرا
حوصلہ لیکن مجھے تیری یتیمی نے دیا

تھم! ذرا بیتابیٔ دل! کیا صدا آتی ہے یہ

لطفِ آبِ چشمۂ حیواں کو شرماتی ہے یہ
دل کو سوزِ عشق کی آتش سے گرماتی ہے یہ
روح کو یادِ الٰہی کی طرح بھاتی ہے یہ
ہاں ادب اے دل! بڑھا اعزاز مشتِ خاک کا
میں مخاطب ہوں جنابِ سیّدِ لولاک کا

اے گرفتارِ یتیمی! اے اسیرِ قیدِ غم
تجھ سے ہے آرامِ جانِ سیّدِ خیرالامم
ناامیدی نے کیے ہیں تجھ پہ کچھ ایسے ستم
چھیڑتا ہے دل کو تیرا نالۂ درد و الم
تیری بے سامانیوں سے کیوں نہ میرا دل جلے
شرم سی آتی ہے تجھ کو بے نوا کہتے ہوئے

خرمنِ جاں کے لئے بجلی ترا افسانہ ہے!
دل نہیں پہلو میں تیرے، غم کا عشرت خانہ ہے
جس پہ بربادی ہو صدقے، وہ ترا ویرانہ ہے!
سہم جائے جس سے فرحت وہ ترا کاشانہ ہے

کانپتا ہے آسماں تیرے دلِ ناشاد سے
ہل گیا عرشِ معظّم بھی تری فریاد سے

خون رُلواتا ہے تیرا دیدۂ گریاں مجھے
کیوں نظر آتا ہے نو رہنِ غم پنہاں مجھے

کیوں نظر آتا ہے تیرا حال بے ساماں مجھے
کیوں نظر آتا ہے تو مثلِ تنِ بے جاں مجھے

میری اُمّت کیا شریکِ دردِ پیغمبر نہیں ؟
کیا جہاں میں عاشقانِ شافعِ محشر نہیں ؟

جس طرح مجھ سے نبوت میں کوئی بڑھ کر نہیں !
میری امت سے حمیّت میں کوئی بڑھ کر نہیں !

امتحانِ صدق ہمت میں کوئی بڑھ کر نہیں !
ہم مسلمانوں سے غیرت میں کوئی بڑھ کر نہیں !

یہ دل و جاں سے خدا کے نام پر قربان ہیں
ہوں فرشتے بھی فدا جن پر یہ وہ انسان ہیں

جا کے یوں کہنا۔ کہ اے گل ہائے باغِ مصطفٰے

تم سے برگشتہ نہ ہو جائے زمانے کی ہوا

عرصۂ ہستی میں از بہرِ حصولِ مدّعا!

رشک صد اکسیر ہوتی ہے یتیموں کی دعا

یہ وہ جادو ہے کہ جس سے دیو حرماں دور ہو!

یہ وہ نسخہ ہے کہ جس سے درد عصیاں دور ہو!

یہ دعا میدانِ محشر میں بڑی کام آئے گی!

شاہدِ شانِ کریمی سے گلے ملوائے گی

آتشِ عشقِ الٰہی سے تمھیں گرمائے گی

جو نہ موسیٰ نے بھی دیکھا تھا۔ تمھیں دکھلائیگی!

جس طرح مجھ کو شہیدِ کربلا سے پیار ہے

حق تعالیٰ کو یتیموں کی دعا سے پیار ہے

جوش میں اپنی رگ ہمت کو لانا چاہیئے

احمدی غیرت زمانے کو دکھانا چاہیئے

بندشِ غم سے یتیموں کو چھڑانا چاہیئے

مل کے اک دریا سخاوت کا بہانا چاہیئے

کام بے دولتِ تہِ چرخ کہن چلتا نہیں
نخل مقصد غیرِ آبِ زر کبھی پھلتا نہیں!

صید شاہین یتیمی کا پھڑکنا اور ہے
نوک جس کی دل میں چبھتی ہو وہ کانٹا اور ہے

علتِ حرماں نصیبی کا مداوا اور ہے
درد آزار مصیبت کا مسیحا اور ہے

پھونک دیتا ہے جگر کو، دل کو تڑپاتا ہے یہ
نسخۂ مہر و محبت سے مگر جاتا ہے یہ

تھی یتیمی کچھ ازل سے آشنا اسلام کی
پہلے رکھی ہے یتیموں نے بنا اسلام کی

کہہ رہی ہے اہل دل سے ابتدا اسلام کی
ہے یتیموں پر عنایت انتہا اسلام کی

تم اگر سمجھو تو یہ سو بات کی اک بات ہے!
آبرو میری یتیمی کی تمہارے ہاتھ ہے!

(*)

فریادِ امت

یہ مقبول نظم ابتدا میں "ابرِ گہربار" کے عنوان سے غالباً ۱۹۱۳ء میں شاعر نے انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں اور اپنے عالمِ خیال میں سردارِ دو عالم، رسولِ اکرم، حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانۂ مبارک پر پڑھی تھی۔ اس میں جس دلی کیفیت کا نقشہ کھینچا ہے، اس سے کون متاثر نہ ہوگا۔ اس طویل نظم کا صرف ایک بند "بانگِ درا" میں بعنوان "دل" شامل کیا گیا ہے اور اس بند کے دو اشعار محذوف ہیں۔

بندِ اول

دل میں جو کچھ ہے نہ لب پر اسے لاؤں کیوں کر؟

ہو چھپانے کی نہ جو بات چھپاؤں کیوں کر

شوقِ نظارہ یہ کہتا ہے قیامت آئے

پھر میں نالوں سے قیامت نہ اٹھاؤں کیوں کر

میری ہستی نے رکھا مجھ سے تجھے پوشیدہ

پھر تری راہ میں اس کو نہ مٹاؤں کیوں کر

دمۂ ہجر میں کیا لطف ہے اللہ اللہ

یہ بھی اک ناز ہے تیرا نہ اٹھاؤں کیوں کر

ندگی تجھ سے ہے اے نارِ محبت میری

اشکِ غم سے ترے شعلوں کو بجھاؤں کیوں کر

جھ میں سو نغمے ہیں اے تارِ ربابِ ہستی!

زخمۂ عشق سے تجھ کو نہ بجاؤں کیوں کر

ضبط کی تاب نہ یارائے خموشی مجھ کو !

ہائے اس دردِ محبت کو چھپاؤں کیوں کر

بات ہے راز کی پر منہ سے نکل جائیگی

یہ مئے کہنہ خُمِ دل سے اچھل جائے گی

۲
بندِ دوم

آسماں مجھ کو بجھا دے جو فروزاں ہوں میں

صورتِ شمعِ سرِ گورِ غریباں ہوں میں

ہوں وہ بیمار جو ہو فکرِ مداوا مجھکو

درد چپکے سے یہ کہتا ہے کہ درماں ہوں میں

دیکھنا! تو میری صورت پہ نہ جانا گلچیں!

دیکھنے کو صفت نو گل خنداں ہوں میں

موت سمجھا ہوں مگر زندگیٔ فانی کو!

نام آجائے جو اس کا تو گریزاں ہوں میں!

دور رہتا ہوں کسی بزم سے اور جیتا ہوں!

یہ بھی جینا ہے کوئی جس سے پشیماں ہوں میں

کنج عزلت سے مجھے عشق نے کھینچا آخر

یہ وہی چیز ہے۔ جس چیز پہ نازاں ہوں میں

داغ دل مہر کی صورت ہے نمایاں لیکن

ہے اسے شوق ابھی اور نمایاں ہوں میں

ضبط کی، جا کے سنا اور کسی کو ناصح ——!

اشک بڑھ بڑھ کے یہ کہتا ہے کہ طوفاں ہوں میں

ہوں وہ مضمون کہ مشکل ہے سمجھنا میرا

کوئی مائل ہو سمجھنے پہ تو آساں ہوں میں

رند کہتا ہے ولی مجھ کو، ولی رند مجھے
سن کے ان دونوں کی تقریر کو حیراں ہوں میں

اہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

کوئی کہتا ہے کہ اقبال ہے صوفی مشرب
کوئی سمجھا ہے کہ شیدائے حسیناں ہوں میں

ہوں عیاں سب پہ مگر پھر بھی ہیں اتنی باتیں
کیا غضب آئے لگاہوں سے جو پنہاں ہوں میں

دیکھ اے چشم عدو مجھ کو حقارت سے نہ دیکھ!
جس پہ خالق کو بھی ہو ناز وہ انساں ہوں میں

مزرع سوختۂ عشق ہے حاصل میرا
درد قربان ہو جس دل پہ وہ ہے دل میرا

بند سوم

کچھ اسی کو ہے مزا دہر میں آزادی کا

جو ہوا قیدیٔ زنجیرِ پری خانۂ دل
ہائے کیا جانئے اس گھر کا مکیں کیسا ہو
ہوں جو منصور سے دربانِ درِ خانۂ دل

بند چہارم

آتی ہے اپنی سمجھ اور پہ مائل ہو کر
آنکھ کھل جاتی ہے انسان کی بے دل ہو کر
لوگ سودا کو یہ کہتے ہیں برا ہوتا ہے
عقل آئی مجھے پابند سلاسل ہو کر
آرزو کا کبھی رونا کبھی اپنا ماتم
اس سے پوچھے کوئی کیا دن بنے لیا دل ہو کر
میری ہستی ہی جو تھی میری نظر کا پردہ
اٹھ گیا بزم سے میں پردۂ محفل ہو کر
عین ہستی ہوا ہستی کا فنا ہو جانا

حق دکھایا مجھے اس نقطے نے باطل ہو کر

خلق معقول ہے محسوس ہے خالق اے دل
دیکھ نادان ذرا آپ سے غافل ہو کر

طور پر تم نے جو اے حضرت موسیٰ دیکھا
وہی کچھ قیس نے دیکھا پس محمل ہو کر

کیا کہوں بے خودیٔ شوق میں لذت کیا ہے
تو نے دیکھا نہیں زاہد کبھی غافل ہو کر

رہِ الفت میں رواں ہوں کبھی افتادہ ہوں
موج ہو کر کبھی خاک لبِ ساحل ہو کر

دمِ خنجر میں دمِ ذبح سماجاتا ہوں !
جوہر آئینۂ خنجر قاتل ہو کر

وہ مسافر ہوں ملے جب نہ پتہ منزل کا
خود بھی مٹ جاؤں نشانِ رہِ منزل ہو کر

ہے فروغِ دو جہاں داغِ محبت کی ضیا
چاند یہ وہ ہے کہ گھٹتا نہیں کامل ہو کر

دیدۂ شوق کو دیدار نہ ہو کیا معنی

آئے محفل میں جو دیدار کے قابل ہو کر

عشق کا تیر قیامت تھا الٰہی توبہ !

دل تڑپتا ہے مرا طائرِ بسمل ہو کر

مئے عرفاں سے مرا کاسۂ دل بھر جائے

میں بھی نکلا ہوں تری راہ میں سائل ہو کر

المدد سید مکی مدنی العربی

دل وجاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

بندِ پنجم

لاکھ سامان ہے اک بے سر و ساماں ہونا

مجھکو جمعیت خاطر ہے پریشاں ہونا

تیری الفت کی اگر ہو نہ حرارت دل میں

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

یہ شہادت گہہِ الفت میں قدم رکھنا ہے

لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

دل جو بہ بادِ محبت ہوا، آباد ہوا ——!

سازِ تعمیر تھا اس قصر کو ویراں ہونا

علم و حکمت کے مدینے کی کشش ہے مجھ کو

لطف دے جاتا ہے کیا کیا مجھے ناداں ہونا

کبھی یثرب میں اویس قرنی سے چھپنا

کبھی برقِ نگہِ موسیٰؑ عمراں ہونا ——!

قاب قوسین بھی دعویٰ ہے عبودیت کا

کبھی چلمن کا اٹھانا کبھی پنہاں ہونا

لطف دیتا ہے مجھے مٹ کے تری الفت میں

ہمہ تن شوق ہوائے عربستاں ہونا

یہی اسلام ہے میرا یہی ایماں میرا

تیرے نظارۂ رخسار سے حیراں ہونا

خندۂ صبح تمنائے براہیمؑ استی

چہرہ پرداز بہ حیرت کدۂ میم استی

بند ششم

حشر میں ابر شفاعت کا گہر بار آیا —!

دیکھ اے جنس عمل تیرا خریدار آیا

میں گیا حشر میں جس دم تو صدا یوں آئی

دیکھنا دیکھنا وہ کافر دیندار آیا

پیرہن عشق کا جب حسن ازل نے پہنا

بن کے یثرب میں وہ آپ اپنا خریدار آیا

لطف آنے کا تو جب ہے کہ کسی پر آئے

ورنہ دل اپنا بھی آنے کو تو سو بار آیا

جوش سودائے محبت میں گریباں اپنا

میں نے دیکھا تو نہ ہاتھوں میں کوئی تار آیا

عشق کی راہ میں اک سیر تھی ہر منزل پر

نجد کا دشت کہیں، مصر کا بازار آیا

میں نے سو گلشن جنت کو کیا اس پہ نثار

دشت یثرب میں اگر زیرِ قدم خار آیا

بس شفاعت نے قیامت میں بلائیں کیا کیا

عرق شرم میں ڈوبا جو گنہ گار آیا

رہ میری شرم گنہ اور وہ سفارش تیری

ہائے اس پیار پہ کیا کیا نہ مجھے پیار آیا

ہے ترے عشق کا میخانہ عجب میخانہ

یعنی ہشیار گیا اور میں سرشار آیا

مَا عَرَفْنَاکے چھپا رکھی ہے عظمت تیری

قاب قوسین سے کھلتی ہے حقیقت تیری

بندِ ہفتم

لے چلا بحرِ محبت کا طلاطم مجھکو

کشتیٔ نوحؑ ہے ہر موجۂ قلزم مجھکو

حسن تیرا نظری آنکھوں میں سمایا جب سے

تیر لگتی ہے شعاعِ مہ و انجم مجھکو

تیرے قربان میں اے ساقیٔ میخانۂ عشق !

میں نے اک جام کہا تو نے دئے خم مجھ کو

خاک ہو کر یہ ملا اوج تیری الفت میں

کہ فرشتوں نے لیا بہر تیمم مجھ کو

گرد آسا سر دامن سے لگا پھرتا ہوں

حشر کے روز بھلا دو نہ کہیں تم مجھ کو

کوئی دیکھے تو ترے عاشقِ شیدا کا مزاج

حور سے کہتا ہے چھیڑا نہ کرو تم مجھ کو

موت آجائے جو یثرب کے کسی کوچے میں

میں نہ اٹھوں جو مسیحا بھی کہے قُم مجھ کو

صفت نوکِ سرِ خار شبِ فرقت میں

چبھ رہی ہے نگہ دیدۂ انجم مجھ کو !

خوف رہتا ہے یہ ہر دم کہ رہِ یثرب سے

طور کی سمت نہ لے جائے توہم مجھ کو

تو نے آنکھوں کے اشارے سے جو تسکیں کر دی ۔

شورِ محشر ہوا گلبانگ ترنّم مجھکو
اپنا مطلب مجھے کہنا ہے۔ مگر تیرے حضور
چھوڑ جائے نہ کہیں تابِ تکلّم مجھ کو
ہے ابھی اُمّتِ مرحوم کا رونا باقی
دیکھ اے بے خودیٔ شوق نہ کر گم مجھ کو
ہمہ حسرت ہوں۔ سراپا غمِ بربادی ہوں
ستمِ دہر کا مارا ہوا فریادی ہوں

بندِ ہشتم

اے کہ تھا نوحؑ کو طوفاں میں سہارا تیرا
اور براہیمؑ کو آتش میں بھروسا تیرا
اے کہ مشعل تھا ترا عالمِ ظلمت میں وجود
اور نورِ نگہِ عرش تھا سایا تیرا
اے کہ پرتو ہے ترے ہاتھ کا مہتاب کا نور
چاند بھی چاند بنا پاکے اشارا تیرا
گرچہ پوشیدہ رہا حسن ترا پردوں میں
ہے عیاں معنیٔ لولاک سے پایا تیرا

ناز تھا حضرتِ موسےٰ کو یدِ بیضا پر
سو تجلّی کا محل نقشِ کفِ پا تیرا

چشمِ ہستی صفت دیدۂ اعمےٰ ہوتی
دیدۂ کُن میں اگر نور نہ ہوتا تیرا

مجھ کو انکار نہیں آمدِ مہدی سے مگر
غیر ممکن ہے کوئی مثل ہو پیدا تیرا

کیا کہوں امّتِ مرحوم کی حالت کیا ہے
جس سے برباد ہوئے ہم وہ مصیبت کیا ہے

بند نہم

حال اُمّت کا بُرا ہو کہ بھلا کہتے ہیں
صفت آئینہ جو کچھ ہے صفا کہتے ہیں

واعظوں میں یہ تکبّر کہ الٰہی توبہ
اپنی ہر بات کو آوازِ خدا کہتے ہیں

ان کے ہر کام میں دنیا طلبی کا سودا
ہاں مگر وعظ میں دُنیا کو بُرا کہتے ہیں

غیر بھی ہو تو اسے چاہئے اچھا کہنا
پر غضب ہے کہ یہ اپنوں کو بُرا کہتے ہیں

فرقہ بندی کی ہوا تیرے گلستاں میں چلی
یہ وہ ناداں ہیں اسے بادِ صبا کہتے ہیں

آہ جس بات سے ہو فتنۂ محشر پیدا
یہ وہ بندے ہیں اسے فتنۂ رُبا کہتے ہیں

جن کی دینداری میں ہو آرزوئے زر پنہاں
آکے دھوکے میں انھیں راہ نما کہتے ہیں

لاکھ اقوام کو دنیا میں اُجاڑا اُس نے
یہ تعصب کو مگر گھر کا دیا کہتے ہیں

خانہ جنگی کو سمجھتے ہیں بنائے ایماں
مرض الموت ہے جو اس کو دوا کہتے ہیں

تیرے پیاروں کا تو یہ حال ہوا شافعِ حشر
میرے جیسوں کو تو کیا جانیے کیا کہتے ہیں

بغض للّٰہ کے پردے میں عداوت ذاتی
دین کی آڑ میں کیا کرتے ہیں کیا کہتے ہیں

جن کا یہ دیں ہو کہ اپنوں سے کریں ترکِ سلام
ایسے بندوں کو یہ بندے صلحا کہتے ہیں

قوم کے عشق میں ہو فکرِ کفن بھی نہ جسے
یہ اسے بندۂ بے دام ہوا کہتے ہیں

وصل ہو لیلیٰ مقصود سے کیوں کر اپنا
اختر سوختۂ قیس ہے اختر اپنا

بندِ دہم

امرا جو ہیں وہ سنتے نہیں اپنا کہنا
سامنے تیرے پڑا ہے مجھے کیا کیا کہنا

ہم جو خاموش تھے اب تک تو ادب مانع تھا
ورنہ آتا تھا ہمیں حرف تمنّا کہنا

دردمندوں کا کہیں حال چھپا رہتا ہے
اپنی خاموشی بھی تھی ایک طرح کا کہنا

شکوہ منّت کشِ لب ہے کبھی منّت کشِ چشم
میرا کہنا جو ہے رونا، تو ہے رونا کہنا

قوم کو قوم بنا سکتے ہیں دولت والے
یہ اگر راہ پہ آجائیں تو پھر کیا کہنا

بادۂ عیش میں سرمست رہا کرتے ہیں
یاد فرماں نہ ترا اور نہ خدا کا کہنا

ہم نے سو بار کہا قوم کی حالت ہے بُری
پر سمجھتے نہیں یہ لوگ ہمارا کہنا

دیکھتے ہیں یہ غریبوں کو تو برہم ہوکر
فقر تھا فخر ترا شاہِ دو عالم ہوکر

بند یازدہم

اس مصیبت میں ہے اک تو ہی سہارا اپنا
تنگ آکر لبِ فریاد ہوا وا اپنا

ایسی حالت میں بھی امید نہ ٹوٹی اپنی
نام لیوا ہیں ترے تجھ پہ ہے دعویٰ اپنا

فرقہ بندی سے کیا راہ نماؤں نے خراب
ہائے اِن مایوں نے باغ اُجاڑا اپنا

ہم نے سوراہ اخوت کی نکالی لیکن
نہ تو اپنا ہوا اپنا، نہ پرایا اپنا

اس مصیبت میں اگر تو بھی ہماری نہ سُنے
اور ہم کس سے کہیں جا کے فسانا اپنا

لطف یہ ہے کہ پھلے قوم کی کھیتی اس سے
ورنہ ہوئے کو تو آنسو بھی ہے دریا اپنا

اب جو ہے ابرِ مصیبت کا دھواں دھار آیا
ڈھونڈتا پھرتا ہے تجھ کو دلِ شیدا اپنا

یوں تو پوشیدہ نہ تھی تجھ سے ہماری حالت
ہم نے گھبرا کے مگر تذکرہ چھیڑا اپنا

زندگی تجھ سے ہے اے فخرِ براہیم اپنی
کر دعا حق سے کہ مشکل ہوا جینا اپنا

ایک یہ بزم ہے لے دے کے ہماری باقی
ہے انہی لوگوں کی ہمت پہ بھروسا اپنا

داستاں درد کی لمبی ہے کہیں کیا تجھ سے
ہے ضعیفوں کو سہارے کی تمنا تجھ سے

بندِ دوازدہم

قوم کو جس سے شفا ہو وہ دوا کون سی ہے
یہ چمن جس سے ہرا ہو وہ صبا کون سی ہے

جس کی تاثیر سے ہو عزتِ دین و دنیا
ہائے اے شافعِ محشر وہ دعا کون سی ہے

جس کی تاثیر سے یک جان ہو اُمّت ساری
ہاں بتا دے ہمیں وہ طرزِ وفا کون سی ہے

جس کے ہر قطرے میں تاثیر ہو یک رنگی کی
ہاں بتا دے وہ مئے ہوش رُبا کون سی ہے

قافلہ جس سے رواں ہو سوئے منزل اپنا
ناقہ وہ کیا ہے۔ وُہ آواز درا کون سی ہے

سب کو دولت کا بھروسا ہے زمانے میں مگر
اپنی اُمید یہاں تیرے سوا کون سی ہے

اپنی کھیتی ہے اُجڑ جانے کو اے ابرِ کرم
تجھکو یاں کھینچ کے لائے وہ ہوا کون سی ہے

ہے نہاں جن کی گدائی میں امیری سب کی

آج دنیا میں وہ بزم فقرا کون سی ہے
تیرے قرباں کہ دکھا دی ہے یہ محفل تونے
میں نے پوچھا جو اخوت کی بنا کون سی ہے
رہ اسی محفل رنگیں کی دکھا دے سب کو
اور اِس بزم کا دیوانہ بنا دے سب کو

غزلیات

"بانگ درا" کے صفحات میں کل ۲۸ غزلیں درج ہیں۔ مگر "مخزن" کے پرچوں کی ورق گردانی سے بہت سی ایسی غزلوں کا سُراغ ملتا ہے۔ جنھیں اول الذکر دیوان میں شامل نہیں کیا گیا۔ نیز کافی تعداد ان اشعار کی بھی پائی جاتی ہے۔ جنھیں "بانگ درا" کی غزلیات میں جگہ نہیں دی گئی۔ ان سب کے مطالعہ سے علامہ اقبال کے ذہنی ارتقاء کا پتہ چلانے میں مدد مل سکتی ہے۔

(۱)

عاشق دیدار محشر کا تمنائی ہوا — وہ سمجھتے ہیں کہ جرم ناشکیبائی ہوا
غیر سے غافل ہوا میں اے نمودِ حسنِ یار — عرصۂ محشر میں پیدا کنجِ تنہائی ہوا

میری یہ بینائی شاید مانعِ دیدار تھی
بند جب آنکھیں ہوئیں تیرا تماشائی ہوا

ہائے میری بدنصیبی وائے ناکامی مری
پاؤں جب ٹوٹے تو شوقِ دشت پیمائی ہوا

میں تو اُس عاشق کے ذوقِ جستجو پر مر مٹا
ما عرفنا کہہ کے جو تیرا تمنائی ہوا

تجھ میں کیا اے عشق وہ اندازِ معشوقانہ تھا
حُسن خود لولاک کہہ کر تیرا شیدائی ہوا

دیکھ ناداں امتیازِ شمع و پروانہ نہ کر
حُسن بن کر عشق اپنا آپ سودائی ہوا

اب مری شہرت کی سوجھی ہے انھیں دیکھے کوئی
پس کے میں جب دم غبارِ کوئے رسوائی ہوا

بغض، اصحابِ ثلاثہ سے نہیں اقبال کو
دق مگر اک خارجی سے آ کے مولائی ہوا

(۲)

ہو شگفتہ ترے دم سے چمنِ دہر تمام
سیر اس باغ کی کر بادِ سحر کی صورت

نام روشن تو رہے عمر ہو گو برق خرام
زندگی چاہیے دنیا میں شرر کی صورت

یہ تو بتلا دے مؤذن کہ تری آنکھوں سے
کیا مروّت بھی گئی خوابِ سحر کی صورت

لطف جب آتا ہے اقبال سخن گوئی کا
شعر نکلے صدفِ دل سے گہر کی صورت

(۳)

سنہ ۱۹۰۳ء کا زمانہ تھا۔ اقبال، گرامی اور بسمل تینوں حضرات ایک مجلس میں تشریف رکھتے تھے۔ صاحب خانہ نے جن کا نام اور تخلص نوازش تھا۔ ایک مصرعہ بر دیف "اہل درد" پڑھ دیا۔ وجہ یہ تھی کہ اقبال نے بیان کیا تھا کہ انھیں دردِ قولنج کی شکایت ہے اور اس وقت اس کے آغاز کے آثار معلوم ہوتے تھے۔ اس پر غزل گوئی کی فرمائش ہوئی اور اقبال نے بحالت درد مندرجہ ذیل دو غزلیں اس زمین میں کہیں۔

زندگی دنیا کی مرگِ ناگہان اہلِ درد
موت پیغامِ حیاتِ جاودانِ اہلِ درد

بند ہو کر اور کھلتی ہے زبانِ اہلِ درد
بولتا ہے مثلِ نے ہر استخوان اہلِ درد

آپ بائع آپ ہی نقد و متاع و مشتری
ساری دنیا سے نرالی ہے دکان اہلِ درد

اس خموشی اور گویائی کے صدقے جایئے
محو شکر بے زبانی ہے زبانِ اہلِ درد

یہ وہ پستی ہے کہ اس پستی میں ہے رفعت نہاں
سر کے بل گرتا ہے گویا نردبان اہلِ درد

بیخودی میں یہ پہنچ جاتے ہیں اپنے آپ تک
عین بیداری نہ ہو خوابِ گرانِ اہلِ درد

ان کی دنیا بھی یہی عرشِ معلّٰی بھی یہی
دل مکان اہلِ درد و لامکانِ اہلِ درد

ہائے کیا محشر پہ واعظ نے اٹھا رکھی ہے بات
ہے اسی دنیا میں ہوتا امتحانِ اہلِ درد

درد ہی کے دم سے ہے ان دل جلوں کی زندگی
درد سے پیدا ہوئی روحِ روانِ اہلِ درد

یہ اجڑ جانے کو آبادی سمجھتے ہیں مگر
ڈھونڈتا ہے راہزن کو کاروانِ اہلِ درد

لیتے ہیں داغِ محبت سے گلِ جنت مراد
ہائے کیا مرغوب ہے طرزِ بیانِ اہلِ درد

ارتجالاً" ہم نے اے اقبال کہہ ڈالے یہ شعر
تھی نوازش کو جو فکرِ امتحانِ اہلِ درد

دیگر

صبر ایوب و فا خو، جزو جانِ اہلِ درد
گریۂ آدم سرشت، دود مانِ اہلِ درد

ہے سکوں نا آشنا۔ طرحِ جہان اہلِ درد
جوں قمر سائر ہے قطب آسمانِ اہلِ درد

اوج یک مشتِ غبار آستانِ اہلِ درد
جوہرِ رفعت بلا گردانِ شان اہلِ درد

پھر رہے ہیں گلشنِ ہستی کے نظاروں میں مست
نکہتِ گُل ہے شرابِ ارغوانِ اہلِ درد

ابتدا میں شرحِ رمز آیۂ لا تقربا!
کس قدر مشکل تھا پہلا امتحانِ اہلِ درد

ہم نشیں رونا ہمارا کچھ نیا رونا نہیں
تھی ہم آہنگ ندائے کن ۔ فغانِ اہلِ درد

شورشِ محشر جسے واعظ نے ہے سمجھا ہوا
ہے وہ گلبانگِ درائے کاروانِ اہلِ درد

بت کدے کی سمت کیوں جاتا ہے یارب برہمن
کعبۂ دل ہی تو ہے ہندوستانِ اہلِ درد

گرمیِ جوشِ عقیدت سے کیا کرتی ہے طَوف
کعبۂ برقِ بلا ہے آشیانِ اہلِ درد

ذبح ہونا کوچۂ اُلفت میں ہے اُن کی نماز

ہے صدا تکبیر کی گویا اذانِ اہلِ درد

دار پر چڑھنا نہ تھا معراج تھا منصور کو
تھی وہ سولی درحقیقت نردبانِ اہلِ درد

موج خون سر مدو تبریزی و منصور سے
کس قدر رنگیں ہے یارب داستانِ اہلِ درد

تونے اے انسانِ غافل آہ کچھ پروا نہ کی
بے زباں طائر سمجھتے تھے زبانِ اہلِ درد

دیدۂ سوزن سے بھی رکھتے ہیں یہ پنہاں اسے
کوئی کیا دیکھے گا زخم بے نشانِ اہلِ درد

دیکھنے والے سمجھتے تھے دم عیسےٰ جسے
تھی وہ اک موجِ نسیم بوستانِ اہلِ درد

پھرتے رہتے ہیں میانِ کوچۂ حبل الورید
ہے اسی آوارگی میں عزوشانِ اہلِ درد

کہہ دیا اقبال اک مصرعہ نوازش نے جو آج
وہ بہانہ ہوگیا بہر بیانِ اہلِ درد

(۴)

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اُٹھا کر

وہ بزمِ یثرب میں آکے بیٹھیں ہزار منہ کو چھُپا چھُپا کر
جو تیرے کوچے کے ساکنوں کا فضائے جنّت میں دل نہ بہلا
تسلّیاں دے رہی ہیں حوریں خوشامدوں سے منامنا کر
بہارِ جنّت کو کھینچتا تھا ہمیں مدینے سے آج رضواں
ہزار مشکل سے اس کو ٹالا بڑے بہانے بنا بنا کر
لحد میں سوتے ہیں تیرے شیدا تو حورِ جنّت کو اس میں کیا ہے
کہ شورِ محشر کو بھیجتی ہے خبر نہیں کیا سکھا سکھا کر
تری جدائی میں خاک ہونا اثر دکھاتا ہے کیمیا کا
دیارِ یثرب میں آ ہی پہنچے صبا کی موجوں میں رل ملا کر
شہیدِ عشقِ نبیؐ کے مرنے میں بانکپن بھی ہیں سو طرح کے
اجل بھی کہتی ہے زندہ باشی ہماوے مرنے پہ زہر کھا کر
رکھی ہوئی کام آ ہی جاتی ہے جنسِ عصیاں عجیب شے ہے
کوئی اُسے پوچھتا پھرے ہے زیرِ شفاعت دکھا دکھا کر
ترے ثنا گو عروس رحمت سے چھیڑ کرتے ہیں روزِ محشر
کہ اس کو پیچھے لگا لیا ہے گناہ اپنے دکھا دکھا کر
کرے کوئی کیا کہ تاڑ لیتی ہے لاکھ پردوں میں بھی شفاعت
رکھے تھے ہم نے گناہ اپنے ترے غضب سے چھُپا چھُپا کر

بنائے دیتے ہیں اے صبا ہم یہ گلستان عرب کی بو ہے
مگر نہ اب ہاتھ لا ادھر کو، وہیں سے لائی ہے تو اڑا کر

تری جدائی میں مرنے والے۔ فنائے تیروں سے بے خطر ہیں
اجل کی ہم نے ہنسی اڑائی اسے کبھی مارا تھکا تھکا کر

ہنسی کبھی کچھ کچھ نکل رہی ہے مجھے کبھی محشر میں تاکتی ہے
کہیں شفاعت نہ لے گئی ہو مری کتاب عمل اُٹھا کر

یہ پردہ داری تو پردہ در ہے مگر شفاعت کا آسرا ہے
دبک کے محشر میں بیٹھ جاتا ہوں دامنِ تر میں منہ چھپا کر

شہید عشق نبیؐ ہوں میری لحد میں شمع قمر جلے گی
اُٹھا کے لائیں گے خود فرشتے چراغ خورشید سے جلا کر

جسے محبت کا درد کہتے ہیں مایۂ زندگی ہے مجھکو
یہ درد وُہ ہے کہ میں نے رکھا ہے دل میں اسکو چھپا چھپا کر

خیال راہ عدم سے اقبال تیرے در پر ہوا ہے حاضر
بغل میں زاد عمل نہیں ہے صلہ مری نعت کا عطا کر

(۵)

مری جاں نہیں ربط غیروں سے اچھا
بھلا میں تمھارا بُرا چاہتا ہوں

مجھے جلوۂ گُل ہے برقِ تجلّی!
سنبھالو مجھے میں گرا چاہتا ہوں۔

نہ کوثر کا خواہاں نہ حوروں کا شیدا
خدا جانے میں کیا ہوں کیا چاہتا ہوں

اگوں، سبز ہوں، پس کے ہوں خونِ آخر
میں قسمت مثالِ حنا چاہتا ہوں

شجر ہوں گری مجھ پہ برقِ محبت
ہرا ہو گیا ہوں، پھلا چاہتا ہوں

مری جاں تری بے حجابی سے پہلے
تری دید کا حوصلا چاہتا ہوں

محبت مٹا دے گی بیگانگی کو
سنبھل بیٹھ میں۔ تو ہوا چاہتا ہوں

ہُوا خاک میں اے ہوائے محبت
مدینے کی جانب اُڑا چاہتا ہوں

چلو مل کے اقبال کے گھر کو ڈھونڈھیں!
کہ میں بھی اسے دیکھنا چاہتا ہوں

(۶)

ہے کلیجا فگار ہونے کو
دامنِ لالہ زار ہونے کو!

عشق وہ چیز ہے کہ جس میں قرار
چاہیئے بے قرار ہونے کو

جستجوئے قفس ہے میرے لئے
خوب سمجھے شکار ہونے کو

پیس ڈالا ہے آسماں نے مجھے
کس کی رہ کا غبار ہونے کو

یار جانی کہیں نہیں ملتا،
یوں تو ہوتے ہیں یار ہونے کو

لالہ اور داغِ دل بہانہ ہے
دل جلوں میں شمار ہونے کو

کیا ادا تھی وہ جاں نثاری میں
تھے وہ مجھ پر نثار ہونے کو

زخم اور سوزنِ رفو توبہ
کھل گیا بستہ کار ہونے کو

وعدہ کرتے ہوئے نہ رک جاؤ
ہے مجھے اعتبار ہونے کو

اُس نے پوچھا کہ کون چھُپتا ہے ہم چھُپے آشکار ہونے کو
ہم نے اقبالؔ عشق بازی کی
پی یہ مے ہوشیار ہونے کو

(۷)

چاہیں اگر تو اپنا کرشمہ دکھائیں ہم
بن کر خیالِ غیر ترے دِل میں آئیں ہم
اچھی کہی شکایتِ جور و جفا کی بھی
اتنی سی بات کے لئے محشر میں جائیں ہم
اے صدمۂ فراق نہ کر ہم سے چھیڑ چھاڑ
تو کس کا ناز ہے کہ تجھے بھی اُٹھائیں ہم
پوچھیں گے آج سُرمۂ دُنبالہ دار سے
کس طرح سے کسی کی نظر میں سمائیں ہم
ہر چیز منع تو ہے ہمیں اے طبیبِ عشق
لیکن بڑھے جو ضعف تو غش بھی نہ کھائیں ہم

(۸)

حباب آسا سرِ موج نفس باندھا ہے محمل کو
ذرا دیکھ اے شررِ ذوقِ فنا مجھ کو کہاں تک ہے۔

وہی اک شعلہ ہے تربت بھی ہے اور شمع تُربت بھی
مزا مرنے کا کچھ پروانۂ آتش بجاں تک ہے

نہ سیکھا تو نے مرغِ رنگ گُل سے رمزِ آزادی
یہ قیدِ بوستاں بلبل خیالِ آشیاں تک ہے

بنائیں چارہ گر نے دیدۂ حیراں کی زنجیریں
نظر آسا مری وحشت میں بیتابی یہاں تک ہے

میں خارِ خشک پہلو شعلۂ گلخن کے قابل ہوں
پڑے رہنا مرا گلشن میں رحمِ باغباں تک ہے

مثالِ عکسِ بے تارِ نفس ہے زندگی میری
تری آسیب کاری اے اجل اقلیمِ جاں تک ہے

زباں تک عقدۂ تب خالہ بن کر رہ گیا مطلب
اثر مجھ دل جلے کی بستہ کاری کا کہاں تک ہے

نہیں منّت پذیرِ چشم رونا شمع سوزاں کا
سمجھ غافل! گدازِ دل میں آزادی کہاں تک ہے

بھلا اے گُل کبھی اس رمز کو تو نے بھی سمجھا ہے؟
تری شبنم فریبی کیوں بہارِ بوستاں تک ہے

جوانی ہے تو ذوقِ آرزو بھی، لطفِ ارماں بھی

ہمارے گھر کی آبادی قیام میہماں تک ہے

ملاحظہ ہو اس شعر میں مصرعہ اولی جس کی اصلاح بانگِ درا میں یوں ہوئی ہے

جوانی ہے تو ذوقِ دید بھی لطفِ تمنا بھی

یہ ہے اقبال فیض یادِ نامِ مرتضےٰ جس سے
نگاہِ فکر میں خلوت سرائے لامکاں تک ہے

(۹)

اڑایا ذوقِ تپش پتنگے نے شمع سے شوقِ اشک باری
کہیں سے سیکھی نماز میں نے لیا کہیں سے سبق وضو کا
جو چاک میرے جگر کے دیکھے، کلی نے بادِ صبا سے پوچھا
یہ آدمی ہے کہ گل ہے منت پذیرِ سوزنِ رفو کا

(۱۰)

دیکھ لیتا ہوں جہاں تنکا کوئی چبھتا ہوا
میں اکٹھا لیتا ہوں اپنے آشیانے کے لئے
ہم صفیرو تم مری عالی نگاہی دیکھنا
شاخ نخل طور تاڑی آشیانے کے لئے
قصہ خواں نے کیوں سنا دی داستاں مجھکو مری
رہ گیا تھا میں ہی کیا اپنے فسانے کے لئے

عشق نے مٹی کو مسجود ملائک کر دیا
ورنہ انساں اور فرشتے سر جھکانے کے لئے

صبحِ پیدائش یہ کہتا تھا کسی سے دردِ عشق
آنکھ رونے کو ہے اور دل ٹوٹ جانے کے لئے

ترک کر دی تھی غزل خوانی مگر اقبال نے
یہ غزل لکھی ہمایوں[1] کو سنانے کے لئے

(۱۱)

موت کی ظلمت میں ہے پنہاں شرابِ زندگی
مر گیا ہوں یوں تو میں لیکن فنا کیوں کر ہوا

یوں تو مرتے ہو ہنسی ٹھٹھے پہ اے اقبال تم
دل تمھارا اس قدر درد آشنا کیوں کر ہوا

---

(۱۲)

مرے پہلو میں دل ہے یا کوئی آئینہ جادو کا
تری صورت نظر آئی مجھے اپنے نظارے میں

جو نکلی نالہ بن کر غنچۂ منقار بلبل سے
وہی نکہت چمن سے اڑ کے جا چمکی ستارے میں

[1] میاں محمد شاہ دین ہمایوں بیرسٹرایٹ لا

نہاں تھا تو تو روشن تھا چراغِ زندگی میرا
مگر موجِ نفس پوشیدہ تھی تیرے نظارے میں

اُتارا میں نے زنجیرِ رسومِ اہلِ ظاہر کو
ملا وہ لطفِ آزادی مجھے تیرے سہارے میں

(۱۳)

کوئی جا کے مسلم خستہ جاں کو سنائے میرا پیام یہ
جو وطن ہے دشمنِ آبرو تو اماں ہے ملکِ حجاز میں

(۱۴)

اے تماشائی مری پستی کا نظارہ تو دیکھ
اسفلِ عالی نظر ہوں، ناقصِ کامل ہوں میں

تم نے تاکا دل کو لیکن اُف رے شوقِ تیرِ عشق
دل سے کہتا ہے جگر۔ تو دل نہیں ہے دل ہوں میں

تجھ میں پوشیدہ ہے لیلیٰ اور ہے لیلیٰ کوئی
کہہ رہا ہے دل ترا۔ لیلیٰ نہیں محمل ہوں میں

کشتِ آزادی کی بجلی تھی مری تقلید ہی
پھونک ڈالی اپنی کھیتی آہ کیا غافل ہوں میں

میں وہی ہوں کھو گیا تھا جس کا دل روزالست

اب نہ پہچانو تو تم جانو وہی بے دل ہوں میں
ہے عبث اے برق تجھ کو میرے حاصل کی تلاش
مجھ پہ آ کر گر کہ اپنا آپ ہی حاصل ہوں میں
جانتا ہوں جلوۂ بے پردہ ہے کاشانہ سوز
سادگی دیکھو کہ پھر دیدار کا سائل ہوں میں
تخم ریزی جس کی ہنگامِ صدائے کُن ہوئی
اُس پُرانی مزرع زرخیز کا حاصل ہوں میں

(۱۵)

میں تاریکی ہوں لیکن مجھ میں پوشیدہ وہ گوہر ہے
جھلک جس کی عیاں ہے اے فلک تیرے نگینوں میں
کہیں لیلےٰ نے شاید دیکھ پائی ہے جھلک تیری
کہ محمل سے نکل کر جا ملی صحرا نشینوں میں
میں اے خضر محبت ڈھونڈتا ہوں اس ولایت کو
جہاں سبزے کی صورت طور اُگتے ہیں زمینوں میں

(۱۶)

بیابانوں میں اے دل اہل دل کی جستجو کیسی
کریں جو پیار انساں سے وہی اللہ والے ہیں

غضب کے من چلے ہیں جنس دل کے بیچنے والے
یہ میرے مال کے ساتھ آپ بھی بک جانے والے ہیں

پتہ یوں تو بتاتے ہیں وہ سب کو لامکاں اپنا
ہمیں معلوم ہے اے دل جہاں کے رہنے والے ہیں

پلا دی اس کو کیا مے ساقیٔ بادِ بہاری نے
زبانِ برگِ گُل پر قطرۂ شبنم کے چھالے ہیں

نہ دیکھ اے دیدۂ خوں بار دل کو کم نگاہی سے
ترے آنسو اسی اُجڑے ہوئے گلشن کے لالے ہیں

دعا دیتا ہوں، روتا ہوں، گلہ کرتا ہوں قسمت کا
ہزاروں ڈھنگ اظہارِ تمنا کے نکالے ہیں

الٰہی کون سا مالی ہے اس دل کے گلستاں کا
امیدوں کے شجر، زخموں کے گل، داغوں کے لالے ہیں

نہیں کچھ امتیازِ ما و تو شہرِ محبت میں
نرالا دیس ہے دستور ہی یاں کے نرالے ہیں

نشانِ ماہِ کنعاں اے زلیخا پوچھ لے مجھ سے
کہ میں نے چاہِ دل سے سیکڑوں یوسف نکالے ہیں

---

(۱۷)

بلاکشانِ محبّت کی یادگار ہوں میں
مٹا ہوا خطِ لوحِ سرِ مزار ہوں میں
فنا ہوئے پہ بھی گویا وفا شعار ہوں میں
جو مٹ گیا تو حسینوں کا اعتبار ہوں میں
نشہ میں مست سمجھتا ہے مجھکو کیوں واعظ
وہ اپنا وعظ کہے جائے، ہوشیار ہوں میں
تڑپ کے شانِ کریمی نے لے لیا بوسہ
کہا جو سر کو جھکا کر گناہ گار ہوں میں
رہی نہ عشق میں اقبال وہ پرانی بات
کسی کے ہجر میں جینے سے شرمسار ہوں میں

(۱۸)

محبت کو ذولت بڑی جانتے ہیں
اسے مایۂ زندگی جانتے ہیں
نرالے ہیں انداز دنیا سے اپنے
کہ تقلید کو خودکشی جانتے ہیں
کوئی قید سمجھے مگر ہم تو اے دل
محبت کو آزادگی جانتے ہیں
حسینوں میں ہیں کچھ وہی ہوش والے
کہ جو حسن کو عارضی جانتے ہیں
جو ہے گلشنِ طور اے دل تجھے ہم
اسی باغ کی اک کلی جانتے ہیں

(۱۹)

سو سو امید بندھتی ہے اِک اک نگاہ پر
مجھکو نہ ایسے پیار سے دیکھا کرے کوئی

دے کر جھلک سی آپ تو پردے میں ہو رہے
اور کہہ گئے نگاہ کو ڈھونڈا کرے کوئی

محفل ہو، شغلِ مے ہو، شبِ ماہتاب ہو
اور میں گروں تو مجھکو سنبھالا کرے کوئی

بولے بھی سُن کے قصۂ ہجراں تو یہ کہا
کی دل لگی تو یہ بھی گوارا کرے کوئی

اقبال عشق نے مرے سب بَل دیئے نکال
مدّت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

(۲۰)

عبادت میں زاہد کا مسرور رہنا
یہی پی کے تھوڑی سی مخمور رہنا

نہ میں تم کو دیکھوں نہ اغیار دیکھیں
مری آنکھ میں صورتِ نور رہنا

نہیں عشق بازی یہ زاہد تو کیا ہے
اسیرِ خمِ گیسوئے طور رہنا!

سکھائی تمھیں کس نے یہ بے حجابی
حسینوں کا شیوہ ہے مستور رہنا

کوئی چال! اس انکساری میں ہوگی
تمھاری تو عادت تھی مغرور رہنا

لگاوٹ کی بے اعتنائی کے صدقے
بڑا کام آیا مجھے دور رہنا

(۲۱)

کوئی یوں گیا ہے ادھر سے نکل کر ۔ قیامت تھی، بجلی تھی، رفتار کیا تھی
نہ چھوڑا کبھی بے وفائی نے تم کو ۔ مری طرح یہ بھی وفادار کیا تھی
ہزاروں کلیجے کو تھامے ہوئے ہیں ۔ الٰہی وہ چشمِ فسوں کار کیا تھی
لپا مغفرت نے تڑپ کر بغل میں ۔ کرامت تھی شرمِ گنہگار کیا تھی

(۲۲)

اثر غضب کا دعائے قدح میں ہے ساقی
کوئی اسے بھی ذرا داخلِ نماز کرے
جواب ملتا ہے لولاک ما عرفنا کا
کوئی جو عجز کے دامن کو یاں دراز کرے
پرانے کفر کو تازہ کروں یہ کہہ کہہ کر
مدینہ وہ ہے کہ کعبہ جدھر نماز کرے
شعاعِ نور کو تاریکیٔ جہاں میں نہ ڈھونڈ
یہی ہے شمع اگر دل کو تو گداز کرے
نہیں ہے فرق محبت میں اور غلامی میں

یہ عشق وُہ ہے کہ محمود کو ایاز کرے

(۲۳)

۱۹۰۳ء میں سیالکوٹ میں ایک تقریب خوشی کی تھی۔ وہاں کے رئیس اعظم آغا محمدؐ باقر خاں صاحب کے فرزند ارجمند آغا محمد ناصر کے ختنہ کے بعد غسلِ صحت کی شادی منائی گئی تھی۔ مجلس میں شیخ محمد اقبالؔ صاحب بھی مدعو تھے۔ کسی نے ایک مصرعہ طرح دیا۔ جس پر یہ غزل ہوئی۔ اور اس غزل کو انھوں نے اپنے دوست کے بیٹے کی اس تقریب سعید کا سہرا قرار دیا۔

ترا اے سیلِ دریائے محبت منہ تکوں کب تک
مری کشتی جو تھی آپ اپنے ہاتھوں سے ڈبو لی ہے

کوئی شوخی تو دیکھے جب ذرا رونا تھما میرا
کہا بے دردنے "کیوں آپ نے مالا پرو لی ہے؟"

جفا جو کہدیا میں نے مگر تم نے بُرا مانا
خفا کیوں ہوگئے یہ عاشقوں کی بولی ٹھولی ہے

شبِ فرقت تصور تھا مرا اعجاز تھا کیا تھا
تری تصویر کو میں نے بلایا ہے تو بولی ہے

تماشائی کوئی آئینۂ ہستی میں ہے اپنا
مزا ہے حسن نے اے دل کتابِ عشق کھولی ہے

ہمیں یاد وطن ! کیا پیش آنا ہے خدا جانے
بھلا تو کس لئے غربت زدوں کے ساتھ ہولی ہے؟
یہ ہوگی شوخ اے صیاد مدت کی اسیری سے
نیا قیدی ہوں میں ۔ آواز میری بھولی بھالی ہے
لہو کی بوندیاں ۔ لالے کی کلیاں بن کے پھوٹی ہیں
مگر زیر زمیں کھیلی ترے کشتوں نے ہولی ہے

(۲۴)

ہو قناعت جو زندگی کا اصول ، تنگ دستی فراخ دستی ہے
جنس دل ہے جہان میں کمیاب پھر بھی یہ شئے غضب کی سستی ہے
تاب اظہار عشق نے لے لی ! گفتگو کو زباں ترستی ہے
شعر بھی اک شراب ہے اے دل ہوشیاری اسی کی مستی ہے
ہم فنا ہوکے بھی فنا نہ ہوئے نیستی اک طرح کی ہستی ہے
آنکھ کو کیا نظر نہیں آتا؟ ابر کی طرح سے برستی ہے
دیکھئے کیا سلوک ہو ۔ اقبال مجرم جرم بت پرستی ہے

متفرقات

دربارِ بہاول پور

نومبر ۱۹۰۳ء کے "مخزن" میں سر شیخ عبدالقادر یوں رقم طراز تھے۔

"ماہ رواں میں چند روز سرزمین بھاولپور نے ایسے دیکھے ہیں۔ جن پر وہ تادیر ناز کرے گی۔ رعایائے بھاول پور کی مخلصانہ دعائیں کامیاب ہوئیں۔ نخل تمنا ہرا ہوا۔ اور شاخ آرزو پھل لائی۔ یعنی حضور پرنور رکن الدولہ۔ نصرت جنگ۔ مخلص الدولہ۔ حافظ الملک۔ ہز ہائی نس نواب محمد بھاول خاں پنجم۔ عبّاسی کو ہز اکسلینسی وائسرائے وگورنر جنرل بہادر کشور ہند نے خود اپنے ہاتھوں سے مسند سلطنت پر بٹھایا۔ اور زمام اختیارات ان کے ہاتھ میں دی۔ اس خوشی کی تقریب میں جو جشن ریاست میں منایا گیا وہ مدتوں یادگار رہے گا۔ زمین بھاول پور ۱۲ر نومبر کی شام کو کثرتِ چراغاں سے رشک آسمان بن رہی تھی۔ اور سارا شہر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک سجی ہوئی دلہن۔ ہجومِ خلائق ایسا کہ معلوم ہوا آبادی گردونواح میں کہیں باقی ہی نہیں رہی۔ سب کھنچ کر بھاول پور میں آگئی ہے۔ رؤسائے عالی تبار اور راجگانِ ذی شان کے علاوہ دیگر معزز مہمان جو ہر فرقے اور ہر طبقہ کے منتخب لوگوں میں تھے اور ملک کے ہر گوشے سے آئے ہوئے

تھے ۔ زینت تقریب کو دو بالا کر رہے تھے۔ حکامِ انگریز کی بھی ایک معقول تعداد رونق بخش جلسہ تھی۔

اس مبارک تقریب پر شیخ محمد اقبال صاحب۔ ایم۔اے سے ایک قصیدہ کہنے کی فرمائش کی گئی تھی۔ اور انھیں مدعو بھی کیا گیا تھا۔ مگر فرض منصبی سے رخصت نہ ملنے کی وجہ سے وہ جانے سے معذور رہے۔ اور قلتِ فرصت سے قصیدہ بھی بعد میں مکمل ہوا۔ اس لئے ہم اسے ان ناچیز اوراق کے ذریعے سے بندگان عالی تک پہنچاتے ہیں۔ صاحبانِ فن دیکھیں گے کہ قصیدہ کی زمین کس قدر مشکل تھی۔ مگر اس میں کیسے کیسے شعر طبع خداداد کے زور سے شاعر نے نکالے ہیں۔ اور پُرانے اور نئے رنگ کو کس خوبی سے ملایا ہے۔ چونکہ اب کا حصۂ نظم پہلے لکھا جا چکا ہے۔ اور اُدھر نثر میں چند صفحوں کی گنجائش ہے۔ اور اس قصیدہ کا اسی مہینے میں شائع ہونا موزوں معلوم ہوتا ہے۔ اس واسطے نثر کے حصے میں اس قصیدہ کو جگہ دیتے ہیں:۔"

بزمِ انجم میں ہے گو چھوٹا سا اک اخترزمیں
آج رفعت میں ثریا سے بھی ہے اُوپر زمیں

اوج میں بالا فلک سے۔ مہر سے تنویر میں
کیا نصیبہ ہے۔ رہی ہر معرکہ میں سرزمیں

انتہائے نور سے ہر ذرّہ اختر خیز ہے
مہر و ماہ و مشتری صینے ہیں اور مصدر زمیں

لے کے پیغام طرب جاتی ہے سوئے آسماں
اب نہ ٹھیرے گی کبھی اطلس کے شانوں پر زمیں

شوق بک جانے کا ہے فیروزۂ گردوں کو بھی
مول لیتی ہے لٹانے کے لئے گوہر زمیں

بسکہ گلشن ریز ہے ہر قطرۂ ابر بہار
ہے شگفتہ صورت طبع سخن گستر زمیں

برگ گل کی رگ میں ہے جنبش رگ جاں کی طرح
ہے امیں اعجاز عیسیٰ کی کہ افسوں گر زمیں

صاف آتا ہے نظر صحن چمن میں عکسِ گل
بن گئی آپ اپنے آئینے کی روشنگر زمیں

خاک پر کھینچیں جو نقشہ مرغِ بسم اللہ کا
قوّتِ پرواز دے دے حرف قم کہکر زمیں

اس قدر نظارہ پرور ہے کہ نرگس کے عوض
خاک سے کرتی ہے پیدا چشم اسکندر زمیں

امتحاں ہو اس کی وسعت کا جو مقصود چمن
خواب میں سبزے کے آئے آسماں بن کر زمیں

چاندنی کے پھول پر ہے ماہ کامل کا سماں

دن کو ہے اوڑھے ہوئے مہتاب کی چادر زمیں
آسماں کہتا ہے ظلمت کا جو ہو دامن میں داغ
دھوئے پانی چشمۂ خورشید سے لے کر زمیں
چومتی ہے دیکھنا جوشِ عقیدت کا کمال
پائے تختِ یادگارِ عمِّ پیغمبرؐ زمیں
زینت مسند ہوا عبّاسیوں کا آفتاب
ہو گئی آزادِ احسانِ شہِ خاور زمیں
یعنی نوّاب بہاول خاں ۔ کرے جس پر فدا
بحر موتی ۔ آسماں انجم ۔ زر و گوہر زمیں
جس کے بدخواہوں کی شمع آرزو کے واسطے
رکھتی ہے آغوش میں صد موجۂ صرصر زمیں
جس کی بزمِ مسند آرائی کے نظارے کو آج
دل کے آئینے سے لائی دیدۂ جوہر زمیں
فیضِ نقشِ پا ہے جس کے ہے وہ جاں بخشی کا ذوق
شمع سے لیتی ہے پروانے کی خاکستر زمیں
جس کی راہ آستاں کو حق نے وہ رتبہ دیا
کہکشاں اس کو سمجھتا ہے فلک محور زمیں

آستانہ جس کا ہے اس قوم کی اُمید گاہ
تھی کبھی جس قوم کے آگے جبیں گستر زمیں

جس کے فیض پا سے ہے شفاف مثل آئینہ
چشم اعدا میں چھپاکر خاک کا عنصر زمیں

جس کے ثانی کو نہ دیکھے مدّتوں ڈھونڈے اگر
ہاتھ میں لے کر چراغ لالۂ احمر زمیں

وہ سراپا نور اک مطلع خطابیہ پڑھوں
جس کے ہر مصرع کو سمجھے مطلع خاور زمیں

اے کہ فیض نقشِ پا سے تیرے گل بر سر زمیں
اے کہ تیرے دم قدم سے خسرو خاور زمیں

اے کہ تیرے آستاں سے آسماں انجم بہ جیب
اے کہ ہے تیرے کرم سے معدنِ گوہر زمیں

لے کے آئی ہے برائے خطبۂ نامِ سعید
چوب نخل طور سے ترشا ہوا منبر زمیں

تیری رفعت سے جو یہ حیرت میں ہے ڈوبا ہوا
جانتی ہے مہر کو ایک مُہرۂ ششدر زمیں

ہے سراپا طور عکس رائے روشن سے ترے

ورنہ تھی بے نور مثل دیدۂ عبہر زمیں!

یہ نازش ہے تو اس خاندان کے واسطے

اب تلک رکھتی ہے جس کی داستاں ازبر زمیں

ترا عہد مبارک صبح حکمت کی نمود

وہ چمک پائے کہ ہو محسود ہر اختر زمیں

منے آنکھوں کے پھر جائے سماں بغداد کا

ہند میں پیدا ہو پھر عبّاسیوں کی سرزمیں

کردے عدل تیرا آسماں کی کج روی

کلیاتِ دہر کے حق میں بنے مسطر زمیں

لح ہو ایسی گلے مل جائیں ناقوس و اذاں

ساتھ مسجد کے رکھے بُت خانہ آفریں

م شاہنشاہ اکبر زندۂ جاوید ہے

ورنہ دامن میں لئے بیٹھی ہے سو قیصر زمیں

بوشاہوں کی عبادت ہے رعیّت پروری

ہے اسی اخلاص کے سجدے سے قائم ہر زمیں

ے مروّت کی صدف میں گوہر تسخیر دل

یہ گہر وہ ہے کرے جس پر فدا کشور زمیں

حکمراں مست شرابِ عیش و عشرت ہو اگر
آسماں کی طرح ہوتی ہے ستم پرور زمیں

عدل ہو مالی اگر اس کا یہی فردوس ہے
ورنہ ہے مٹّی کا ڈھیلا خاک کا پیکر زمیں

ہے گل و گلزار محنت کے عرق سے سلطنت
ہو نہ یہ پانی تو پھر سرسبز ہو کیوں کر زمیں

چاہیئے پہرا دماغ عاقبت اندیش کا
بے دری میں ہے مثال گنبد اخضر زمیں

لامکاں تک کیوں نہ جائے گی دعا اقبال کی
عرش تک پہنچی ہے جس کے شعر کی اڑ کر زمیں

خاندان تیرا رہے۔ زیبندۂ تاج و سریر
جب تلک مثلِ قمر کھاتی رہے چکر زمیں

مسند احباب رفعت سے ثریّا بوس ہو
خاک رختِ خواب ہو اعدا کا اور بستر زمیں

تیرے دشمن کو اگر شوقِ گل و گلزار ہو!
باغ میں سبزے کی جا پیدا کرے نشتر زمیں

ہو اگر پنہاں تری ہیبت سے ڈر کر زیر خاک

مانگ کر لائے شعاعِ مہر سے خنجر زمیں!
پاک ہے گرد غرض سے آئینہ اشعار کا
جو فلک رفعت میں ہو لایا ہوں وہ چُن کر زمیں
تھی تو پتھر ہی مگر مدحت سرا کے واسطے
ہو گئی ہے گُل کی پتّی سے بھی نازک تر زمیں

ہلالِ عید

اے مہِ عید بے حجاب ہے تو
حسنِ خورشید کا جواب ہے تو

اے گریبان جامۂ شبِ عید
شاہدِ عیش کا شباب ہے تو

اے نشانِ رکوعِ سورۂ نور
نقشۂ کلک انتخاب ہے تو

اے جوابِ خطِ رکوعِ نیاز
طاعتِ صوم کا ثواب ہے تو

ہائے اے حلقۂ پرِ طاؤس
قابلِ ذالک الکتاب ہے تو

چشمِ طفلی نے جب تجھے دیکھا
کہہ دیا خواب ہے کہ خواب ہے تو

طوف منزل گہہِ زمیں کے لئے
ہمہ تن پائے در رکاب ہے تو

یہ اُبھرتے ہی آنکھ سے چھُپنا
روشنی کا مگر حجاب ہے تو

تو کمند غزال شادی ہے
لذت افزائے شور طفلی ہے

مدینے کے کبوتر کی یاد!

رحمت ہو تیری جان پر اے مرغِ نامہ بر
آیا تھا اُڑ کے رفعتِ بامِ حرم سے تو
پرواز جبرئیل تھی تیری اُڑان میں!
کرتا نہ کیوں حدوث کو پیدا قدم سے تو
زمزم میں تر ہوئی تری منقارِ نغمہ ریز
کرتا رہا عرب کو نمایاں عجم سے تو!
جاں کو بسا دیا تھا شمیمِ حجاز میں
لایا تھا تار توڑ کے زلفِ صنم سے تو
ہم کو دیا پیام الف لام میم کا!
ناآشنا نہ تھا رہ و رسمِ الم سے تو
نفرت ہی آشیانۂ ہستی سے تھی تو کیوں
آیا اُتر کے طارمِ کاخِ عدم سے تو

تجھ پر ابوہریرہؓ بھی قربان ہوں کہ تھا
وابستگانِ دامنِ فخر الامم سے تو!
شاید انھیں کی راہ میں تو ہوگیا نثار
گر بچ سکا نہ گربہ کی مشقِ ستم سے تو

نگاہ پائی ازل سے جو نکتہ بیں میں نے
ہر ایک چیز میں دیکھا اسے مکیں میں نے

سوالِ دید میں لذت ہے اے کلیم ایسی
ہزار بار سنی ہے وہی نہیں میں نے

کہا کسی نے فسانہ جو عرش و کرسی کا
وہ سادہ لوح ہوں میں کر لیا یقیں میں نے

کبھی میں قتل ہوا کربلا کے میداں میں
کہی کسی کو ستم پر بھی آفریں میں نے

اٹھائے تلخیٔ انکار میں مزے کیا کیا
بنا کے ایک زمانے کو نکتہ چیں میں نے

عجیب طرز ہے کچھ گفتگوئے واعظ کا
خدا بچائے یہ باتیں سنی نہ تھیں میں نے

وہ چیز نام ہے جس کا جہاں میں آزادی
سنی ضرور ہے دیکھی نہیں کہیں میں نے

نہ توڑ میرے دلِ دردمند کو ظالم!
بڑی تلاش سے پایا ہے یہ نگیں میں نے

خدا تو ملتا ہے انسان ہی نہیں ملتا
یہ چیز وہ ہے کہ دیکھی کہیں کہیں میں نے

عجیب شے ہے صنم خانۂ امیر اقبال
میں بت پرست ہوں رکھ دی کہیں جبیں میں نے

ماتمِ پسر

(ماخوذ از "مخزن" سنہ ۱۹۰۲ء)

ہمارے ایک عنایت فرما رئیس بارہ مولا علاقہ کشمیر خواجہ صمد جو صاحب ککرو ہیں۔ انھیں چند ماہ ہوئے اپنے چہیتے اور ہونہار بیٹے کی مرگ ناگہاں کا داغ دیکھنا نصیب ہوا۔ خواجہ صاحب ذی علم۔ علم دوست۔ رئیس ہیں اور خود زبان فارسی میں طبّاع شاعر ہیں۔ اور مقبلؔ تخلص کرتے ہیں۔ مگر اس رنج نے ان کی طباعی اور زندہ دلی پر پانی پھیر دیا ہے اور انھیں تصویر غم بنا دیا ہے۔ شیخ محمد اقبال صاحب نے ان کی طرف سے مرحوم کا نوحہ لکھا ہے جو درج ذیل ہے:۔

اندھیرا صمدؔ کا مکاں ہو گیا
وہ خورشید روشن نہاں ہو گیا!

بیاباں ہماری سرا بن گئی،
مسافر وطن کو رواں ہو گیا!

گیا اُڑ کے وہ بلبلِ خوش نوا
چمن پائمالِ خزاں ہو گیا

نہیں باغ کشمیر میں وہ بہار
نظر سے جو وہ گل نہاں ہو گیا

گیا کارواں، اور میں راہ میں
غبارِ رہِ کارواں ہو گیا!

گرا کٹ کے آنکھوں سے لختِ جگر
مرے صبر کا امتحاں ہو گیا

بڑھا اور اک دشمنِ جانستاں
دھواں آہ کا آسماں ہو گیا

ستم اس غضب کا خزاں نے کیا
بیاباں مرا بوستاں ہوگیا

ہوئی غم کی عادت کچھ ایسی مجھے
کہ غم مجھ کو آرامِ جاں ہوگیا

کسی نوجواں کی جدائی میں قد
جوانی میں مثلِ کماں ہوگیا

جدائی میں نالاں ہو بلبل نہ کیوں
وہ گُل زیب باغِ جناں ہوگیا

وہ سرخی ہے۔ اشک شفق رنگ میں
حریفِ مئے ارغواں ہوگیا

بنایا تھا ڈر ڈر کے جو آشیاں
وہی نذر برقِ طپاں ہوگیا

کروں، ضبط اے ہم نشیں کس طرح
کہ ہر اشک طوفاں نشاں ہوگیا

غضب ہے غلامِ حسن کا فراق
کہ جینا بھی مجھکو گراں ہوگیا

دیا چُن کے وہ غم فلک نے اسے
کہ مقبل سراپا فغاں ہوگیا

اے حبابِ بحر اے پروردۂ دامانِ موج
کچھ پتہ ملتا ہے تجھ سے اپنی ہستی کا مجھے

کھل گئی چشمِ تماشہ اپنی جس دم اے کلیم
طور ہر ذرّے کے دامن میں نظر آیا مجھے

موت یہ میری نہیں میری اجل کی موت ہے
کیوں ڈروں اس سے کہ مرکر پھر نہیں مرنا مجھے

کب ہنسا تھا جو یہ کہتے ہو کہ رونا ہوگا ہو رہے گا مری قسمت میں جو ہونا ہوگا
خندۂ گل پہ مجھے آج تو ہنس لینے دو پھر اسی بات پہ رو لوں گا جو رونا ہوگا

ہم کو اقبالؔ مصیبت میں مزہ ملتا ہے
ہم تو اس بات پہ ہنستے ہیں کہ رونا ہوگا

کہتا ہے خضر دشت جنوں میں مجھے کہ چل
آتا ہوں میں بھی پاؤں سے کانٹے نکال کے

کشمیر کا چمن جو مجھے دل پذیر ہے اس باغِ جاں فزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثہ میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

یوں تو اے صیاد آزادی میں ہیں لاکھوں مزے
دام کے نیچے پھڑکنے کا تماشہ اور ہے

تعلق پھول ہیں گویا ریاض آفرینش کے
مگر دیکھا تو کانٹے بھی یہی دامن کے نکلے ہیں

مینارِ دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ
یہ انتظارِ مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے
ہاں اے شرابِ عشق یہ دن ہیں نمود کے
ایسی اُچھل کہ خلوتِ مینا بھی چھوڑ دے

جلوۂ گُل کا ہے اک دام نمایاں بلبل
اس گلستاں میں ہیں پوشیدہ کئی دام ابھی
ہم صفا لذتِ آزادیٔ پرواز کجا!
بے پری سے ہے نشیمن بھی مجھے دام ابھی

جنھوں نے میری زبان گویا کو محشرستاں صدا کا جانا
مرا وہ دل چیر کر جو دیکھیں تو واں سکوت مزار ہوگا

چھپا کر حضرت واعظ سے رکھا شیشۂ مے کو
مرے کام آگئی آخر زمین زیر منبر بھی!

دیارِ خاموشِ دل میں ایسا ستم کشِ دردِ جستجو ہو

کہ اپنے سینے میں آپ پوشیدہ صورت حرف راز ہو جا

تا کجا طور پہ دریوزہ گری مثل کلیم

اپنی مٹی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

عید آئی ہے اے لباس کہن! اب ترے چاک پھر سلائیں گے

رہین لذت ہستی نہ ہو کہ مثل شرار

یہ راہ ایک نفس میں تمام کرتے ہیں

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور

یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور!

ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر

بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور!

پنجۂ ظلم و جہالت نے برا حال کیا

بن کے مقراض ہمیں بے پر و بے بال کیا

ر اس دستِ جفاکیش کو یارب جس نے روح آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

کشاں میں آکے اختر مل گئے اک لڑی میں آکے گوہر مل گئے
ہ واکیا محفلِ احباب ہے ! ہموطن غربت میں آکر مل گئے

چاند!

ے قمر کیا خامشی افزا ہے تیری روشنی
رات کے دامن میں ہے گویا سحر سوئی ہوئی
ن کامل تیری صورت کا نشاط انگیز ہے
چاندنی میں تیری اک تسکین غم آمیز ہے
ھر بنایا تو نے گو ہنگامۂ ہستی سے دور
چاندنی تیری نہیں انسان کی بستی سے دور
ب اُتر آ میرے دل میں ساتھ لے کر چاندنی
اس اندھیرے گھر میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی

"ڈھب کوئی قوم فروشی کا نہیں یاد مجھے"

یہ قطعہ انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں پڑھا گیا تھا اور "بانگ درا"

میں اسے زیرِ عنوان "نصیحت" شامل کرلیا گیا ہے۔ مگر اس ردّوبدل کے ساتھ کہ مطلع میں مصرعِ اولیٰ کو جو ابتداءً استفہامیہ تھا۔ بیانیہ کردیا گیا۔ اس صورت میں مندرجہ ذیل اشعار محذوف ہوئے۔

کل ملا مجھ سے جو اقبال تو پوچھا میں نے
عامل روزہ ہے تو۔ اور نہ پابندِ نماز

("بانگ درا"۔ میں نے اقبال سے ازراہ نصیحت یہ کہا)

کبھی ایراں کے لئے ہو جو دعا کا جلسہ
عذر تیرا ہے کہ ہے میری طبیعت ناساز

سُن کے کہنے لگا اقبال بجا فرمایا
شک مجھے آپ کی باتوں میں نہیں بندہ نواز

مجھ میں اوصاف ضروری تو ہیں موجود مگر
ہے کمی ایک۔ کہوں تم سے جو ہو فاش نہ راز

ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی
اور پنجاب میں ملتا نہیں اُستاد کوئی

سپاس جنابِ امیرؓ

مطبوعہ "مخزن" جنوری ۱۹۰۵ء

"ذیل کی نظم درج کرکے آج ہم ان احباب کے تقاضوں سے سبک دوش ہوتے ہیں۔ جو پروفیسر اقبال صاحب کے فارسی کلام کے لئے اکثر دفعہ بے حد اشتیاق ظاہر کیا کرتے ہیں۔ فارسی نظمیں عموماً 'مخزن' میں درج نہیں ہوتیں۔ تاہم احباب کے اصرار سے ہم اسے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ یہی نظم بہ اظہار عقیدت شیخ صاحب سبح کے وقت پڑھا کرتے ہیں"۔

اے محو ثنائے تو زبانہا — اے یوسف کاروان جانہا
اے باب مدینۂ محبت — اے نوح سفینۂ محبت
اے حاجیٔ نقش باطل من — اے فاتح خیبرِ دلِ من
اے سرخطِ وجوب و امکاں — تفسیر تو سورہائے قرآں
اے مذہبِ عشق را نمازے — اے سینۂ تو امین رازے
اے سترِ نبوتِ محمدؐ — اے وصف تو مدحتِ محمدؐ
گردوں کہ برفعت ایستاداست — اے بامِ بلند تو فتاداست
ہر ذرہ درگہت چو منصور — در جوش ترانۂ اَنَا الطور

فردوس ز تو چمن در آغوش	از شانِ تو حیرت آئینه پوش
جانم بغلامیِ تو خوشتر!	سر بر زده ام ز جیب قنبر
هشیارم و مستِ بادهٔ تو	چو سایه ز پا فتادهٔ تو
از هوش شدم مگر بهوشم	گوئی که نصیریِ خموشم
دانم که ادب به ضبطِ راز است	در پردهٔ خامشی نیاز است
اما چه کنم مئے تو لا!	تند است برون فتد ز مینا

ز اندیشهٔ عاقبت رهیدم
جنس غمِ آلِ تو خریدم

فکرم چو بجستجو قدم زد	در دیر شد و در حرم زد
در دشت طلب بسے دویدم	دامن چو گرد باد چیدم
در آبله خارها خلیده!	صد لاله تہِ قدم دمیده
افتاده گره بروئے کارم	شرمندهٔ دامنے غبارم
پویان بے خضر، سوئے منزل	بر دوش خیال بسته محمل،
جویائے مے و شکسته جامے	چوں صبح بباد چیده دامے
پیچیده بے خود چو موج دریا	آواره چو گرد باد صحرا
وامانده ز درد نارسیدن	در آبلهٔ شکستهٔ دامن
عشق تو دلم ربود ناگاه	از کار گره کشود ناگاه

آگاہ زہستی و عدم ساخت — بُت خانۂ عقل را حرم ساخت
چوں برق بجز منم گذر کرد — از لذتِ سوختن خبر کرد
بر باد متاع ہستیم داد — جامے زمئے حقیقتم داد!
سرمست شدم ز پا فتادم — چوں عکس زخود جدا فتادم
پیراہن ما و من دریدم — چوں اشک زچشم خود چکیدم
خاکم بفرازِ عرش بردی — زاں راز کہ با دلم سپردی
واصل بکنار کشتیم شد — طوفانِ جمال زشتیم شد
جز عشق حکایتے ندارم — پروائے ملامتے ندارم

از جلوۂ علم بے نیازم
سوزم - گریم - تپم - گدازم

خطاب بہ تاجدارِ دکن

اقبال نے اس نظم کے ساتھ فارسی کی مثنوی "رموزِ بے خودی" کا ایک نسخہ اعلیحضرت بندگان عالی کی خدمت اقدس میں بطور ہدیۂ محضر ارسال کیا تھا - جسے شرفِ قبولیت حاصل ہوا۔

اے مقامت برتر از چرخ بریں — از تو باقی سطوت دیں مبیں

جلوۂ صدیق از سیمائے تو | حافظ ما تیغ جوشن خائے تو
از تو ما را صبح خنداں شام ہند | آستانت مرکز اسلام ہند
دوش ملت زندہ از امروز تو | تاب ایں برق کہن از سوز تو
بندگانیم ما تو خواجہ | از پئے فردائے ما دیباچہ
گوہرم را شوخی اش بے باک کرد | تا گریبانِ صدف را چاک کرد
پیش سلطاں ایں گہر آوردہ ام | قطرۂ خونِ جگر آوردہ ام

خلافت اور ترک و عرب

"معارف" کے ایک قدیم شمارے میں اس نوٹ کے ساتھ مندرجہ ذیل چار اشعار پائے جاتے ہیں :۔

"حضرت گرامی کی غزل میں ایک شعر تھا :۔

ماہ را بر فلک دو نیم کند | فقر را ترکمانیٔ ہم ہست

جو حضرت اقبال کو بہت پسند آیا تھا۔ اور اس پر تضمین کی تھی۔ حضرت اقبال اپنے ایک گرامی نامہ میں ہمیں کہتے ہیں کہ 'پیام مشرق' میں اس واسطے اس کو داخل نہ کیا کہ اس کے اشعار کی بندش کچھ بہت پسند نہ آئی۔ اگر آپ کو پسند ہو تو مجھے اشاعت میں کوئی عذر نہیں۔ یہ سچ ہے کہ پیام مشرق کے ساز میں یہ لحن شیرازی کچھ زیادہ ساموزوں

نہ ہو تو بھی اس سے الگ اقبال کی صدا کا ہر حرف گوشوارۂ حقیقت ہے۔"

سخنے راندہ کہ جز فرشی — بر سر مسند نبی نہ نشست
درس گیراز "گرامی" ہمہ درد — کہ بر پیداز خود و باو پیوست
رمز ترک و خلافت عربی — گفت آں میگسار بزم الست

"ماہ را بر فلک دو نیم کند
فقر را ترکمانیٔ ہم ہست"

آفتاب

اس عنوان سے صرف نظم "بانگ درا" میں موجود ہے۔ لیکن ۱۹۰۲ء کے "مخزن" کے ایک شمارے میں اقبال" کا تمہیدی نوٹ بھی شامل تھا۔ جس کے ساتھ اس نظم کو پڑھنے سے لطف اور دوبالا ہو جاتا ہے۔

ذیل کے اشعار رگ وید کی ایک نہایت قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہیں جس کو گایتری کہتے ہیں۔ یہ دعا اعتراف عبودیت کی صورت میں گویا ان تاثرات کا اظہار ہے جنھوں نے نظام عالم کے حیرت ناک مظاہر کے مشاہدہ سے اول اول انسان ضعیف البنیان کے دل میں ہجوم کیا ہوگا۔ اس قسم کی قدیم تحریروں کا مطالعہ علم ملل و النحل کے عالموں کے لئے انتہا درجہ کا ضروری ہے۔ کیونکہ ان سے انسان کے روحانی نمو کی ابتدائی مراحل کا پتہ چلتا ہے۔

یہی وہ دعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے۔ اور جس کو برہمن اس قدر مقدس سمجھتا ہے کہ بے طہارت اور کسی کے سامنے اس کو پڑھتا تک نہیں۔

جو لوگ مختتین السنہ شرقیہ کی تصانیف سے واقف ہیں۔ ان کو معلوم ہے کہ سر ولیم جونس مرحوم کو اس دعا کے معلوم کرنے میں کس قدر تکلیف اور محنت برداشت کرنی پڑی تھی۔ مغربی زبانوں میں اس کے بہت سے ترجمے کئے گئے ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ زبان سنسکرت کی نحوی پیچیدگیوں کی وجہ سے السنۂ حال میں وضاحت کے ساتھ اس کا مفہوم ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔ اس مقام پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصل سنسکرت میں لفظ سوِتر استعمال کیا گیا ہے۔ جس کے لئے اردو لفظ نہ مل سکنے کے باعث ہم نے لفظ آفتاب رکھا ہے لیکن اصل میں اس لفظ سے مراد اُس آفتاب کی ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے یہ مادی آفتاب کسب ضیاء کرتا ہے۔ اکثر قدیم قوموں نے اور نیز صوفیاء نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو نور سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور شیخ محی الدین ابن عربیؒ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ ایک نور ہے جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں۔ لیکن وہ خود نظر نہیں آتا۔ علیٰ ہذا القیاس افلاطونِ الٰہی کے مصری پیروؤں اور ایران کے قدیم انبیا کا بھی یہی مذہب تھا۔

ترجمہ کی مشکلات سے ہر شخص واقف ہے۔ لیکن اس خاص صورت میں یہ دقت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ اصل الفاظ کی موسیقیت اور وہ طمانیت آمیز اثر جو ان کے پڑھنے سے دل پر ہوتا ہے۔ اُردو زبان میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ گائتری کے مصنف نے ملک الشعراء

ٹنی سن مرحوم کی طرح اپنے اشعار میں ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جن میں حروف علت اور صحیح کی قدرتی ترتیب سے ایک ایسی لطیف موسیقیت پیدا ہوجاتی ہے جس کا غیر زبان میں منتقل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ اسی مجبوری کی وجہ سے میں نے اپنے ترجمہ کی بنیاد اس سوکت (گفتار زیبا) پر رکھی ہے۔ جس کو سریا نرائن اپنیشد میں گانیتری مذکور کی شرح کے طور پر لکھا گیا ہے۔ ترجمہ کرنے کو تو میں نے کردیا ہے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ سنسکرت داں اصحاب اس پر وہی رائے قائم کرینگے جو چیپ مین نے پوپ کا ترجمہ ہومر پڑھکر قائم کی تھی۔ یعنی شعر تو خاصے ہیں۔ لیکن یہ گانیتری نہیں ہے۔

کوہستان ہمالہ

سر شیخ عبدالقادر مرحوم ومغفور "بانگ درا" کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ "شیخ محمد اقبال نے ایک جلسہ میں اپنی وہ نظم جس میں کوہ ہمالہ سے خطاب ہے پڑھکر سنائی۔ اس میں انگریزی خیالات تھے اور فارسی بندشیں۔ اس پر خوبی یہ کہ وطن پرستی کی چاشنی اس میں موجود تھی۔ مذاق زمانہ اور ضروریات وقت کے موافق ہونے کے سبب بہت مقبول ہوئی اور کئی طرف سے فرمائشیں ہونے لگیں کہ اسے شائع کیا جائے۔ مگر شیخ صاحب یہ عذر کرکے کہ ابھی نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے گئے اور وہ اس وقت چھپنے نہ پائی۔ اس بات کو تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ میں نے ادب اردو کی ترقی کے لئے رسالہ مخزن جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ اس اثنا میں شیخ محمد اقبال سے میری دوستانہ ملاقات پیدا ہوچکی تھی۔ میں نے ان سے وعدہ لیا کہ اس رسالہ کے حصۂ نظم

کے لئے وہ نئے رنگ کی نظمیں مجھے دیا کریں گے۔ پہلا رسالہ شائع ہونے کو تھا کہ میں ان کے پاس گیا اور میں نے ان سے کوئی نظم مانگی۔ انھوں نے کہا ابھی کوئی نظم تیار نہیں۔ میں نے کہا "ہمالہ" والی نظم دے دیجئے۔ اور دوسرے مہینے کے لئے کوئی اور لکھئے۔ انھوں نے اُس نظم کے دینے میں پس و پیش کی۔ کیونکہ انھیں یہی خیال تھا کہ اس میں کچھ خامیاں ہیں۔ مگر میں دیکھ چکا تھا۔ کہ وہ بہت مقبول ہوئی۔ اس لئے میں نے زبردستی وہ نظم ان سے لے لی۔ اور مخزن کی پہلی جلد کے پہلے نمبر میں جو اپریل ۱۹۰۱ء میں نکلا۔ شائع کر دی۔"

ذیل میں وہی نظم جو بہ عنوان بالا "مخزن" کی پہلی جلد کے پہلے نمبر میں شائع ہوئی تھی۔ بلاکم و کاست درج کی جاتی ہے۔

اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ پہ کچھ ظاہر نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے دورۂ شام و سحر کے درمیاں

تیری ہستی پر نہیں باد تغیر کا اثر
خندہ زن ہے تیری شوکت گردش ایام پر

امتحان دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو
پاسباں اپنا ہے تو۔ دیوار ہندوستاں ہے تو
سوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تو
مطلع اوّل فلک جس کا ہو وہ درباں ہے تو

برف نے باندھی ہے دستار فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہ مہرِ عالمتاب پر

سلسلہ تیرا ہے یا بحر بلندی موج زن
رقص کرتی ہے مزے سے جس پہ سورج کی کرن

تیری ہر چوٹی کا دامان فلک میں ہے وطن — چشمۂ دامن میں رہتی ہے مگر پرتو فگن

چشمۂ دامن ہے یا آئینۂ سیال ہے
دامنِ موجِ ہوا جس کے لئے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوار ہوا کے واسطے — تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کہسار نے
اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے — دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لئے

ہائے کیا جوشِ مسرت میں اڑا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صورت چلا جاتا ہے ابر

جنبشِ موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی — جھومتی ہے کیا مزے لے لے کے ہر گل کی کلی
یوں زبانِ برگ سے کہتی ہے اس کی خامشی — دستِ گل چیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی

کہہ رہی ہے میری خاموشی ۔ ہے افسانہ مرا
کنجِ قدرت ۔ خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

نہر چلتی ہے سرودِ خامشی گاتی ہوئی — آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی مانند لہراتی ہوئی — ناز کرتی ہے فرازِ راہ سے جاتی ہوئی

چھیڑتا جا اس عراقِ دل نشیں کے ساز کو
اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلیٰ شب کھولتی ہے آکے جب زلفِ رسا — دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا — وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

چوں جرس صد نالۂ رسوا کشید
عیش ہم در منزل جاناں ندید

در محبت پیرو فرہاد بود — بر لب او شعلۂ فریاد بود
تخم نخل آہ در کہسار کاشت — طاقت پیکار با خسرو نداشت
مسلم و ایمان او زنار دار — رخنہ اندر دینش از مژگان یار
آنچناں مست شراب بندگی است — خواجہ و محروم ذوق خواجگی است
دعویٔ او نیست غیر از قال و قیل — "دست او کوتاہ و خرما بر نخیل"
آں فقیہ ملت مے خوارگاں — آں امام امت بے چارگاں
گو سفند است و نوا آموخت است — عشوہ و ناز و ادا آموخت است
دلربا یہاے او زہر است و بس — چشم او غارتگر شہر است و بس،
ضعف را نام توانائی دہد ! — ساز او اقوام را اغوا کند!
از بزیوناں ، زمیں زیرک تر است — پردۂ عودش حجاب اکبر است
نغمۂ چنگش دلیل انحطاط — ہاتف او جبرئیل انحطاط
بگذر از جامش کہ در میناے خویش — چوں مریداں[۱] حسن دارد حشیش؛

از تخیل جنتے پیدا کند
مر ترا بر نیستی شیدا کند

ناوک اندازے کہ تاب از دل برد — ناوک او مرگ را شیریں کند

۱ فرقہ باطنیہ

مارِ گلزارے کہ دارد زہر ناب — صید را اوّل ہمی آرد بخواب
عشق باسحر نگاہش خودکشی است — کشتنش مشکل کہ مار خانگی است
حافظ جادو بیاں شیرازی است — عرفیؔ آتش زباں شیرازی است
ایں سوئے ملک خودی مرکب جہاند — آں کنار آب رکن آباد ماند
ایں قتیل ہمت مردانہ — آں ز رمز زندگی بیگانہ!
دست ایں گیرد ز انجم خوشہ — چشم آں از اشک دارد توشہ
روزِ محشر رحم اگر گوید بگیر! — عرفیا! فردوس و حورا، و حریر
غیرتِ او خندہ بر حورا زند! — پشت پا بر جنّت الماوے زند
بادہ زن با عرفیؔ ہنگامہ خیز — زندۂ؟ از صحبت حافظ گریز
ایں فسوں خواں زندگی از مار بود — جام او شان جمی از مار بود
محفل او در خور ابرار نیست — ساغر او قابل احرار نیست

بے نیاز از محفل حافظ گذر
الحذر از گوسفنداں الحذر

پیش کش

(بحضور سر سیّد علی امام مدظلہ العالی)

علامہ اقبالؒ کی یہ نظم مثنوی اسرار خودی کے پہلے اڈیشن میں درج ہے جو ۱۹۱۴ء

میں ایک محدود تعداد میں شائع ہوئی تھی۔

اے امام! اے سیّد والانسب
دود ما نت فخر اشراف عرب

سلطنت را دیدہ افروز آمدی
عقل کل را حکمت آموز آمدی

آشنائے معنیٔ بے گانہ!
جلوۂ شمع مرا پروانہ

مرغ فکرم گلستانہا دیدہ است
از ریاض زندگی گل چیدہ است

ایں گل از تار رگِ جاں بستہ ام
تازہ تر در دست تو گلدستہ ام

بود نقش ہستیم انگارۂ!!
نا قبولے ناکسے ناکارۂ!

عشق سوہاں زد مرا آدم شدم
عالم کیف و کم عالم شدم!

حرکت اعصاب گردوں دیدہ ام
در رگِ مہ دورۂ خوں دیدہ ام

بہر انساں چشم من شبہا گریست
تا دریدم پردۂ اسرار زیست

از درونِ کارگاہِ ممکنات
برکشیدم سرِّ تقویم حیات

من کہ ایں شب را چو مہ آراستم
گرد پائے ملّت بیضا ستم!

ملتے در باغ و راغ آوازہ اش
آتشِ دلہا سرود تازہ اش

ذرّہ کشت و آفتاب انبار کرد
خرمن از صد رومی و عطار کرد

آہِ گرمم رخت بر گردوں کشم
گرچہ دودم از تبارِ آتشم

خامہ ام از ہمّت فکر بلند!
راز ایں منہ پردہ در صحرا فگند

قطرہ تا ہم پایۂ دریا شود　　ذرّہ از بالیدگی صحرا شود
ملّت ار جسم است، شاعر چشم اوست　　جسم را از چشم بینا آبروست
چشم از نور محبّت روشنم!　　اشک بار از درد اعضائے تنم

نذرِ اشکِ بے قرار از من پذیر
گریۂ بے اختیار از من پذیر

درمیان کارزار کفر و دیں　　ترکش ما را خدنگ آخریں

یہ شعر "اسرار خودی" کی نظم "حکایت شیر و شہنشاہ عالمگیرؒ" کا جزو ہے۔ ہز ایکسیلنسی شیخ دین محمد صاحب کی رائے میں اورنگ زیب کی بزرگی اور صفات ستودہ کی ایسی جامع تفسیر اور کہیں نہیں ملتی۔ شہنشاہ کی بلندیٔ کردار اور جدّتِ افکار کا نچوڑ اس شعر میں موجود ہے۔

صاحب موصوف نے اپنی اس رائے کا اظہار جب حکیم امرت کے سامنے فرمایا تو یہ جواب ملا "دین محمدؐ! یہ چالیسویں سعی ہے۔"

شام

مصرِ ہستی میں شام آتی ہے　　رنگ اپنا جمائے جاتی ہے
اے سبوئے مئے شفق اے شام　　تو مئے بے خودی پلاتی ہے
سرمۂ دیدۂ اُفق بن کر　　چشم ہستی میں تو سماتی ہے

کس خموشی سے اُڑ رہے ہیں طیور
تو رہِ آشیاں دکھاتی ہے

ریزشِ دانہ ہائے اختر کو
مزرعِ آسماں میں لاتی ہے

تو ہر طیرِ آشیاں رو کو!
چشمِ صیاد سے چھپاتی ہے

صبح در آستیں ہے تو شاید
آنکھ اختر کی کھلتی جاتی ہے

تو پیامِ وفاتِ بیداری!
محفلِ زندگی میں لاتی ہے

اپنے دامن میں بھر غنچۂ گل
خواب لے کر چمن میں آتی ہے

خامشی زا ہے تیرا نظّارہ
آہ یہ حسنِ انجمن آرا

دُنیا

چمن خار خار ہے دنیا
خونِ صد نو بہار ہے دنیا

ہے تمنّا فزا ہوائے جہاں
کیا شکستِ خمار ہے دنیا

جان لیتی ہے جستجو اس کی
دولت زیر مار ہے دنیا

ہے نسیم جہاں خزاں پرور
دیکھنے کو بہار ہے دنیا

زندگی نام رکھ دیا کس نے
موت کا انتظار ہے دنیا

خون روتا ہے شوق منزل کا
رہزنِ رہ گزار ہے دنیا

خندہ زن ہے فلک زدوں پہ جہاں
چرخ کی رازدار ہے دنیا

ہیں جہاں کو غموں کے خار پسند
اس چمن کو نہیں بہار پسند

مفلسی

ہاتھ اے مفلسی صفا ہے ترا
ہائے کیا تیرے خط ہے ترا

تیرہ روزی کا ہے تجھی پہ مدار
بدنصیبی کو آسرا ہے ترا

مایۂ صد شکست قیمت دل
دہر میں ایک سا منا ہے ترا

مسکراتا ہے تجھ کو دیکھ کے زخم
یہ کوئی صورت آشنا ہے ترا

موت مانگے سے بھی نہیں آتی
درد کیا زندگی فزا ہے ترا

شور آواز چاک پیراہن!
لبِ اظہار مدعا ہے ترا

التجا پر خموشیٔ منعم!
ایک فقرہ جلا بھنا ہے ترا

ہے جو دل میں نہاں کہیں کیونکر
ہائے تیرے ستم سہیں کیوں کر

خندہ ہے بہر طلسمِ غنچہ تمہیدِ شکست
تو تبسم سے مری کلیوں کو نامحرم سمجھ

درد کے پانی سے ہے، سرسبزیٔ کشتِ سخن
فطرتِ شاعر کے آئینہ میں جوہر غم سمجھ

محترمہ عطیہ بیگم فیضی صاحبہ اپنی کتاب "اقبال" (بزبانِ انگریزی) جو فروری ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ یوں رقم طراز ہیں:-

"۱۹۰۸ء میں مجھے دوبارہ یورپ جانے کا اتفاق ہوا۔ میرے ہمراہ میری بہن رفیعہ سلطان نازلی بیگم آف جنجیرہ اور اُن کے خاوند ہز ہائنس نواب سدی احمد خاں بھی تھے۔ اُس وقت اقبالؔ نے ہم سے ملاقات کی اور مندرجہ ذیل قطعہ میری بہن کی بیاض میں تحریر کیا:"

اے کہ تیرے آستانے پر جبیں گستر قمر
اور فیضِ آستاں بوسی سے گل بر سر قمر
روشنی لے کر تری موجِ غبارِ راہ سے
دیتا ہے لیلائے شب کو نور کی چادر قمر
کاروانِ قوم کو ہے تجھ سے زینت اس طرح
جس طرح گردوں پہ صدر محفلِ اختر قمر
شمع بزم اہل ملت را چراغِ طور کُن
یعنی ظلمت خانۂ ما را سراپا نور کُن

مکافاتِ عمل

ہر عمل کے لئے ہے ردِّ عمل ! دہر میں عیش کا جواب ہے نیش
شیر سے آسمان لیتا ہے انتقام غزال و اشتر و میش
سرگذشتِ جہاں کا سرِّ خفی کہہ گیا ہے۔ کوئی نکو اندیش

شمع پروانہ را بسوخت ولے
زود بریاں شود بروغن خویش

عہدِ طفلی

اس مسدس کے مندرجہ ذیل تین بند "بانگ درا" کی زینت نہ بن سکے :-

ہاں اٹھا اے ساحرِ ایام یہ جادو ذرا
ابلقِ گردوں نہ ہو محوِ رمِ آہو ذرا!
ہائے پھر آجا کہیں سے عمرِ رفتہ تو ذرا
لا وُہ نظّارہ پئے چشمِ تماشہ جو ذرا
خون رُلواتے ہیں ایام جوانی کے مزے

لا کہیں سے پھر وہی ایامِ طفلی کے مزے

ہائے وہ عالم کہ عالمگیر تھی اپنی ادا
غیرتِ صد فصلِ گُل تھی اپنے گلشن کی ہوا
مکتبِ طفلی میں غیر از درس آزادی نہ تھا
زنگِ افکارِ جہاں سے شیشۂ دل تھا صفا
مایہ دارِ صد مسرت اک تبسّم تھا مرا
گوشِ دل لگ جائیں جس پر وہ تکلّم تھا مرا
آہ اے دنیا نمک پاشِ خراشِ دل ہے تو
جس کے ہر دانہ میں سو بجلی ہے وہ حاصل ہے تو
جو مسافر سے پرے رہتی ہے وہ منزل ہے تو
جس کی لیلےٰ مایۂ وحشت ہو وہ محمل ہے تو
تیرے ہاتھوں کوئی جو پائے مئے تسکیں نہ ہو
ایمن از مارِ زمینِ گلستاں گُل چیں نہ ہو

رُخصت اے بزمِ جہاں

اس نظم کا ابتدائی عنوان "بیراگ" تھا۔ اور اس کا جزو مندرجہ ذیل چھ اشعار بھی

تھے۔ جو "بانگِ درا" میں نہیں ملتے۔

زخمِ پیکاں ہے نگاہِ چشمِ لَو دولت مجھے
ہے ترے عجزِ خوشامد زادہ سے نفرت مجھے

مدتوں ضبطِ تکلّم کے ستم سہتا رہا
اشک کی صورت میں اپنا حال دل کہتا رہا

اب مگر بارِ خموشی میں اٹھا سکتا نہیں!
آئینہ مشرب ہوں راز اپنا چھپا سکتا نہیں

مل کے رہتی ہیں تہِ دامانِ دریا مچھلیاں
یعنی وہ چاندی کے طائر بے پر و بے آشیاں

مل کے اُڑتے مل کے گاتے ہیں گلستاں میں طیور
خیمہ زن انسان ہیں شہروں میں ویرانوں سے دور

کوہ کے دامن میں کیا بے مدّعا پھرتا ہوں میں
کیا مصاف زندگی سے بھاگتا پھرتا ہوں میں

عشق اور موت

اس نظم کے مندرجہ ذیل اشعار محذوف ہیں:-

کہیں عجز سے گردنیں جُھک رہی تھیں
رعونت کہیں مانعِ بندگی تھی !

پتنگا کہیں مست ذوقِ تپیدن
کہیں شمع کو نازشِ دل بَری تھی

جو قمری کو ملتا تھا طوقِ غلامی
صنوبر کو انعامِ آزادگی تھی !

یہ گرمِ فغاں تھی وہ محوِ تبسّم
جو بُلبل کا غم تھا وہ گُل کی خوشی تھی

وہ دردِ محبّت وہ ایمانِ ہستی
وہ افشانِ حسنِ ازل کا ستارا

سرِ کوہ چمکے جو وہ بَن کے بجلی
تو ہو غیرتِ طور ہر سنگِ خارا

ابرِ کُہسار

اس مسدّس میں کل دس بند تھے۔ مگر "بانگ درا" کے لئے صرف چار بند منتخب

کئے گئے ۔ باقی چھ بند درجِ ذیل ہیں۔

غنچۂ گل مرے سایہ سے چٹک جاتا ہے
اخترِ قسمتِ گلزار چمک جاتا ہے

میرا ہر قطرہ گلستاں پہ ٹپک جاتا ہے
دلِ بلبل کی طرح گل سے اٹک جاتا ہے

دل لگی کوہ کے چشموں سے مجھے بھاتی ہے
زندگی اپنی اسی طرح گذر جاتی ہے

ہے مجھے دامنِ کہسار میں سننے کا مزا
نغمۂ دخترِ دوشیزۂ دہقاں کی صدا!

وہ سرِ کوہ سے تھم تھم کے اترنا اس کا
حشر ڈھاتی ہے یہ آہستہ خرامی کی ادا

سر پہ وہ دودھ کی ٹھلیا کو اٹھائے آنا
اور تھم تھم کے اُترتے ہوئے گاتے آنا!

قدم اپنا جو سوئے شہر و دیار اُٹھتا ہے
شیشۂ خاطرِ محزوں سے غبار اُٹھتا ہے

کوئی کہتا ہے کہ وہ ابر بہار اٹھتا ہے
اور کوئی جوش طرب میں یہ پکار اُٹھتا ہے
تند و پر شور و سیہ مست ز کہسار آمد
مے کشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

میری عادت میں ہے اک شور مچاتے آنا
سر کہسار سے طنبور بجاتے آنا!
چھیڑ سے باغ کی کلیوں کو ہنساتے آنا
شکوہ ہائے ستم مہر مٹاتے آنا!
تو سنِ باد پہ اُڑتا ہوا آتا ہوں میں
گرمیٔ مہر کے کشتوں کا مسیحا ہوں میں

اُٹھ گیا موجِ ہوا سے کبھی دامن جو ذرا
ہو گیا عارضِ خاتونِ فلک بے پروا
وہ ضیا گستر عالم - وہ عروسِ زیبا
نام انسان کی بولی میں قمر ہے جس کا

ظر آتے ہیں مگر پردہ نشیں چھپتے ہیں
روئے تاباں کی جھلک دے کے حسیں چھپتے ہیں

ی ذرا دست درزی جو ہوا نے مجھ پر
چاک دامن سے دمکتے نظر آئے اختر
ہ سے چلنے میں نہ ہوگا کوئی غافل بڑھ کر
گر پڑے ہیں مرے دامن کی گرہ کھل کے گہر
صد صدف قلزم زخّار ہوں میں
ابر رحمت ہوں۔ گہر وار گہر بار ہوں میں

سیّد کی لوحِ تُربت

اس نظم کے یہ اشعار "بانگ درا" میں نہیں ملتے:۔

ے کہ زائر بن کے میری قبر پر آیا ہے تو
اے کہ مستانہ مئے حسنِ عقیدت کا ہے تو
وہ تظارہ ہے یاں ہر گل سراپا دیدہ ہے
اپنی گلشن کی زمیں میں باغباں خوابیدہ ہے

ہے خموشی یاں رہینِ لذتِ تقریر دیکھ
دیدۂ باطن سے تو اس لوح کی تحریر دیکھ

دیکھ اپنوں میں کہیں پیدا نہ ہو بیگانگی
چل نہ جائے تیرے گلشن میں ہوا پیکار کی

دین کے پردے میں تو دنیا کا سودائی نہ ہو
آڑ میں مذہب کے شوقِ عزت افزائی نہ ہو

گالیاں دینا کسی کو دین کی خدمت نہیں
یہ تعصب کوئی مفتاحِ درِ جنت نہیں

ایک سالی لوکوی

"جنوری ۱۹۳۱ء میں جب اقبال مجھ سے ملنے آئے۔ میرے ساتھ ایک خاتون بھی موجود تھیں۔ یہ خاتون ماہر موسیقی تھیں اور ان کی آواز میں بلا کا درد اور سوز تھا۔ چنانچہ انھوں نے ایوان رفعت کے بام پر سرِ شام جب نغمہ چھیڑا تو ایک سماں بندھ گیا۔ اور بعد میں اقبال نے یہ نظم لکھ کر بھیج دی۔"

(ماخوذ از "اقبال" مصنفہ عطیہ بیگم فیضی)

رخصت ہمیں ماں دیں نہ پھوپھی دیں نہ پدر دیں

حیران ہیں کیوں کر رہ معبود میں سردیں
وجیں جو بڑھی آتی ہیں پس پا انھیں کردیں
ایک آن میں یہ دشتِ وغا لاشوں سے بھر دیں
آفت میں کوئی پوچھنے والا ہی نہ ہوتا
اے کاش پھوپھی نے ہمیں پالا ہی نہ ہوتا

کیسے یہ مصیبت فلک پیر نے ڈالی
جائیں گے کہاں جب نہ رہے سید عالی
نے دوست نہ غم خوار نہ مولیٰ نہ حوالی
یہ آج کا جینا نہیں دو حال سے خالی
یا دشت میں یا کوہ کے داماں میں رہیں گے :
یا بیڑیاں پہنے ہوئے زنداں میں رہیں گے

پھر خاک ہے گر عمر ملے لاکھ برس کی
بلبل سے جب اٹھتی نہیں تکلیف قفس کی
واں نہروں کو آتی ہے یہ آواز جرس کی
ایذا ہے مسافر کو فقط چند نفس کی
اس دن کے سوا توشۂ عقبیٰ نہ ملیگا

ڈھونڈے گا تو پھر قافلہ ایسا نہ ملے گا

اے مالک منہاج علیؓ راہ دکھا دے
دروازۂ رحمت مجھے للّٰہ دِکھا دے
جس در کا ہوں مشتاق وہ درگاہ دکھا دے
دربارِ شہنشاہِ فلک جاہ دکھا دے
واں پہنچوں جہاں عرش بھی پایا نہیں رکھتا
ہمسایہ میں اس کا ہوں جو سایا نہیں رکھتا

فاطمہ بنت عبداللہ

اس نظم کے چار اشعار حذف کر دیئے گئے اور دو شعروں کی ایسی اصلاح ہوئی کہ ندرت بیان کو چار چاند لگ گئے۔ اشعار حسبِ ذیل ہیں:۔

کِس قدر عزّت تجھے اے حورِ صحرائی ملی
غازیانِ ملّتِ بیضا کی سقّائی ملی
"یہ سعادت حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی"
"غازیانِ دیں کی سقّائی تری قسمت میں تھی"

ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر

دِل کہ برگِ نازکِ گل سے بھی تھا پاکیزہ تر

موت کے اندیشۂ جانکاہ سے بیگانہ تھا

موجۂ خوں کی ہم آغوشی سے بھی ڈرتا نہ تھا

سینۂ ملّت میں ایسا جلوۂ نادیدہ تھا

جس کے نظارے میں اک عالم سراپا دیدہ تھا

یعنی نوزائیدہ تاروں کا فضا میں ہے ظہور

دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موجِ نور

"تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور" (بانگ درا)

"دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موجِ نور"

ہے ابھی جن کے لئے رفتار کی لذّت نئی

آسماں کا خم نیا وسعت نئی عظمت نئی!

پیامِ صبح

اس عنوان کے تحت مندرجہ ذیل اشعار "بانگ درا" میں نہیں ملتے:

ہلادی اُس نے زنجیر درِ مے خانہ یہ کہکر

اٹھو دروازہ کھولو نسخۂ خوابِ پریشاں کا !

اٹھایا آکے سبزے کو صدائے قم باذنی سے
دبایا پائے نازک اس نے ہر طفل دبستاں کا
اٹھایا قطرۂ شبنم کو اس نے بسترِ گل سے
چھڑایا نیند کے ہاتھوں سے دامن نرگستاں کا

موجِ دریا

اس مسدس کا حسب ذیل بند "بانگِ درا" میں نہیں ملتا۔

غنچۂ آب میں گلشن کی تماشائی ہوں
اپنی ہستی کو مٹانے کی تمنائی ہوں
کشتۂ عشق ہوں۔ مجرم ہوں۔ شکیبائی ہوں
حوصلہ دیکھ کہ میں بحر کی شیدائی ہوں
زندگی جزو کی ہے کُل میں فنا ہو جانا
"درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا"

ظریفانہ کلام

اقبالؔ کا ظریفانہ کلام اپنے زمانے کے سیاسی مدوجزر کی عکاسی کرتا ہے "بانگ درا" کی اشاعت سے پیشتر علامہ مرحوم نے مزاحیہ رنگ میں اپنے ہم عصر سیاسی کرداروں کی فطرت وطینت کا نہایت پر لطف انداز میں خاکہ کھینچا تھا۔ مگر بعد میں بربنائے مصلحت اس قسم کے کلام کو "بانگ درا" میں شامل نہیں فرمایا۔ مندرجہ ذیل اشعار اس زمانے کی یادگار ہیں جب گاندھی جی اور مدن موہن مالویہ ہندوستان کے میدان سیاست میں ہمعصر شہسوار سمجھے جاتے تھے۔

گاندھی سے ایک روز یہ کہتے تھے مالوی
کمزور کی کمند ہے دنیا میں نارسا

نازک یہ سلطنت صفت برگ گل نہیں
لے جائے گلستاں سے اُڑا کر جسے صبا!

گاڑھا ادھر ہے زیب بدن اور زرہ اُدھر
صرصر کی رہ گزار میں کیا عرض ہو بھلا

پس کر ملے گا گرد رہِ روزگار میں
دانہ جو آسیا سے ہوا قوت آزما

بولا یہ بات سن کے کمال وقار سے

وہ مرد پختہ کار و حق اندیش و باصفا

خارا حریف سعی ضعیفاں نمی شود

صد کوچہ است در بن دنداں خلال را

اتنی خدمت کی ہے خلق اللہ کی
دیکھئے ہوتے ہیں کب "سر" مالوی

مسلم ناداں کو کیا معلوم ہے
کس خدا کے ہیں پیمبر مالوی

خوب تھا یہ خالصہ جی کا بچن!
کب ہے گاندھی کے برابر مالوی

مرد میداں گاندھئ درویش خو
اور کونسل کے سپیکر مالوی

دیگر

پٹی خوب جمن کے ہاتھوں نصیبن
گئی عرس میں اور شب بھر نہ آئی

نہیں بار صاحب کے ٹیبل پہ اس کو
پڑی روپ بسکٹ کا دھارے خطائی

خدا کی زمیں تھی مزارع نے جوتی
کمائی مگر چودھری جی نے کھائی

عمل عاشقوں کے ہیں بے طور سارے
نہیں اس کمیٹی کا کوئی ایجنڈا!

تمھیں ہند سرمایہ دارو مبارک
سلامت رہے مجھ کو بیجی یو گنڈا

میں ڈنڈے پہ شاکر تو انڈے پہ راضی میرا پیر ڈنڈا، ترا پیر انڈا

جناب شیخ کو پلواؤ خاص لندن کی
عجیب نسخہ ہے یہ خود فراموشی کے لئے
ہمارے حق میں تو جینا بتر ہے مرنے سے
جو زندہ ہیں تو فقط آپ کی خوشی کے لئے
ہوا میں جینے سے بیزار جب تو فرمایا
کہاں سے لاؤ گے بندوق خودکشی کے لئے

بخت مسلم کی شب تار سے ڈرتی ہے سحر
تیرگی میں ہے یہ شب دیدۂ آہو کی طرح
ہے اندھیرے میں فقط مولوی صاحب کی نمود
بن کے شمس العلما چمکے ہیں جگنو کی طرح

دستور تھا کہ ہوتا تھا پہلے زمانے میں
ملا کا محتسب کا، خدا کا، نبیؐ کا ڈر!
دو خوف رہ گئے ہیں ہمارے زمانے میں

مضمون نگار۔ بیوی کا سی۔آئی۔ڈی کا ڈر

ہند کی کیا پوچھتے ہو اے حسینانِ فرنگ
دل گراں۔ ہمت سُبک، ووٹر فزوں، روزی تنگ

بے ٹکٹ بے پاس۔ بھارت کی سیاسی ریل میں
ہو گیا آخر سیتا بھی مع اسباب بُک

"لک ودن" کا حکم تھا اس بندۂ اللہ کو
اب یہ سُنتے ہیں نکلنے کو ہے مسلم "آؤٹ لک"

کیا عجب پہلے ہی "لیڈر" میں یہ کردے آشکار
کس طرح "آیا" کوے کراڑ گیا صاحب کا "ٹک"

ختم تھا مرحوم اکبر پر ہی یہ رنگِ سُخن!
ہر سخنور کی یہاں طبع رواں جاتی ہے رُک

قافیہ اک اور بھی اچھا تھا لیکن کیا کریں
کر دیا متروک دلی کے زباں دانوں نے ٹک

"انساں ہوئے مہذب لیکن مزا تو جب ہے"
جنگل میں کہہ رہی تھی ہاتھی سے کل یہ ہتنی

تقریر کو کھڑی ہو کلو میاں کی بیوی
پردھان ہو سبھا کی بنسی کی دھرم پتنی

ہر محکمے میں عہدے تقسیم ہوں برابر
ہوتی نہیں ہے ہم کو جنگ وجدل سے سیری
خفیہ پولیس میں جب سے حد ہو گئی ہے قائم
ہندو ہیں پیڈ افسر مسلم ہیں آنریری

کہی اچھی نقیب انجمن نے وہ سمجھے گا اسے جو کارداں ہے
خدا واحد ہے۔ دو ناظم ہیں اپنے دو عملے میں ہمارا آشیاں ہے

اخبار میں یہ لکھتا ہے لندن کا پادری !
ہم کو نہیں ہے مذہبِ اسلام سے عناد
لیکن وہ ظلم ننگ ہے تہذیب کے لئے
کرتے ہیں ارمنوں پہ جو ترکانِ بدنہاد
مسلم بھی ہوں حمایتِ حق میں ہمارے ساتھ
مٹ جائے تا جہاں سے بنائے شر و فساد

سُن کر یہ بات خوب کہا شہنواز نے
چوہے کو بلّی دیتی ہے پیغامِ اتحاد!

لندن کے چرخِ نادرہ فن سے پہاڑ پر
اُترے مسیح بن کے محمّد علی جناح
نکلے گی تن سے تو کہ رہے گی۔ بتا ہمیں
اے جانِ بر لب آمدہ اب تیری کیا صلاح
دل سے خیال دشت و بیاباں نکال دے
مجنوں کے واسطے ہے یہی جادۂ فلاح
آغا امام اور محمّد علی ہے باب!
اس دین میں ہے ترکِ سوادِ حرم مباح
بشریٰ لکم کہ منتظر ما رسیدہ است
یعنی حجابِ غیبتِ کبریٰ رسیدہ است

دل شمعِ صفتِ عشق سے ہو نور سراپا
اور فکر یوں روشن ہو کہ آئینہ ہو گویا
نیکی ہو ہر اک فعل میں نیت کی ہویدا

ہر حال میں ہو خالقِ ہستی پہ بھروسا
ایسی کوئی نعمت تہِ افلاک نہیں ہے!
یہ بات جو حاصل ہو تو کچھ باک نہیں ہے

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ باغ
غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خون شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

مندمل زخمِ دل بنگال آخر ہو گیا
وہ جو تھی پہلے تمیز کافر و مومن گئی
تاج شاہی یعنی کلکتے سے دہلی آگیا
مل گئی بابو کو جوتی اور پگڑی چھن گئی

ملنے کا پتہ

تاج کمپنی لمیٹڈ۔ بندر روڈ۔ کراچی

تاج کمپنی لمیٹڈ۔ ریلوے روڈ۔ لاہور

مشہور آفسٹ پریس میکلوڈ روڈ کراچی میں باہتمام
حکیم محمد تقی صاحب چھپی مسز سعادت امجد بی۔ اے بی۔ ٹی
نے تاج کمپنی لمیٹڈ۔ بندر روڈ کراچی سے شائع کی۔